

کتابخانه



کرشن چندر





# جشنِ حماقت

طنزیت - مزاحیہ مضامین کا مجموعہ



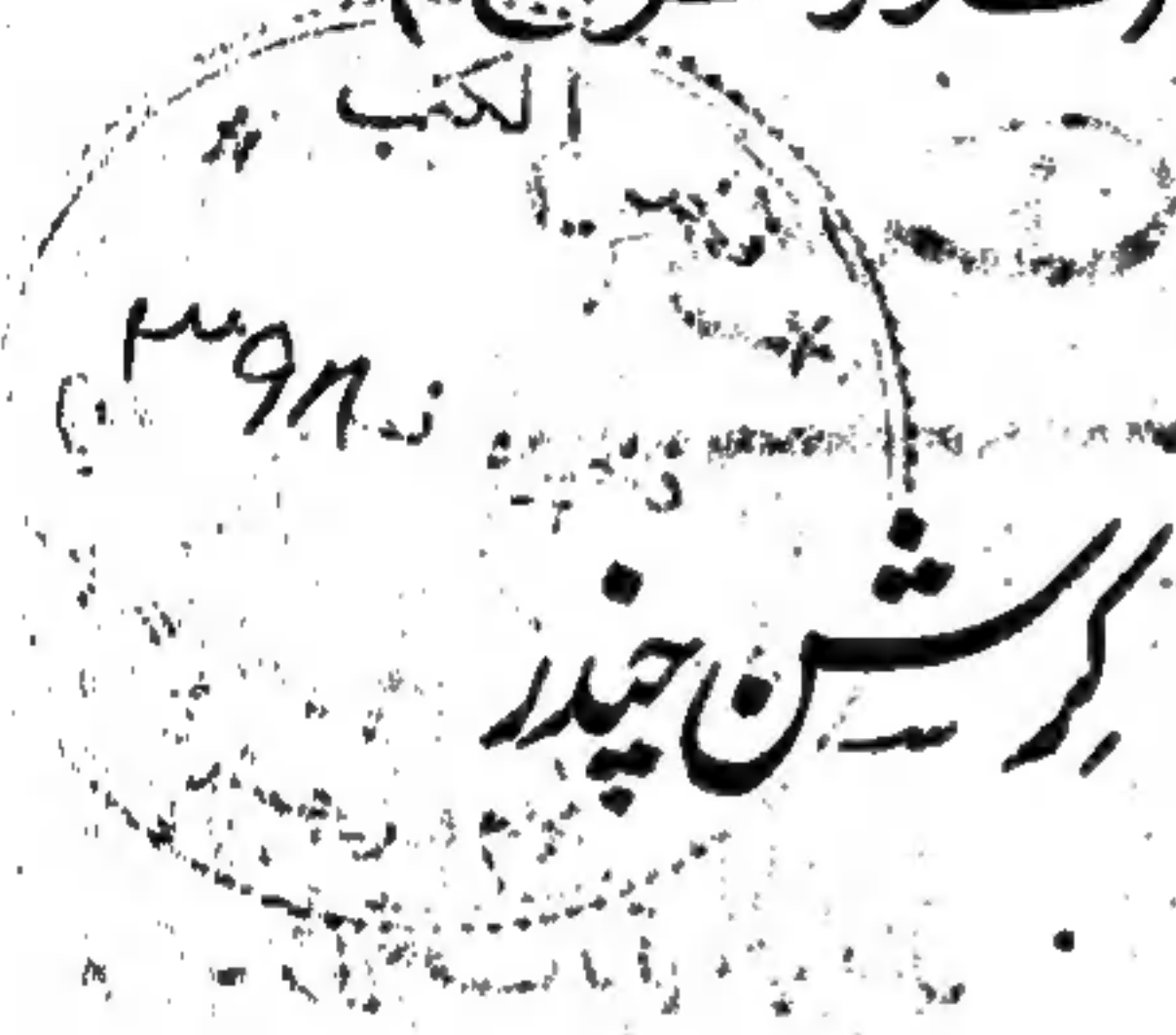
جہاد حقوق سے مجتہد مصنف محفوظ ہیں



طابع : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور  
ناشر : محمد طہر نقوی - علی برادرزادہ (جسٹریٹ) - لاہور  
بار : اول ۱۹۸۴ء  
تعداد : ایک ہزار  
قیمت : پندرہ روپے  
سرورق : سلیم اختر  
کتابت : محمد صدیق نسرا

# حسنِ حماقت

(طنز و مزاح)



عظیم

پبلشرز: بک سٹیلز

۱۱۷۔ ذوالقرنین چیمبرز، اردو بازار، لاہور

# فہرست

۶	• کرشن چندر۔ آدمی ہی آدمی
۱۲	• ماہر نفسیات
۱۶	• ایک لڑکی بگھارتی ہے وال
۲۰	• ایک دوست کی موت پر
۲۹	• تقارن
۶۸	• رونا
۷۴	• شیطان کا استغفار
۸۳	• ہیر رانجھا
۹۲	• گواہ
۹۹	• بڑے آدمی

۱۰۹

• ردی

۱۲۰

• میرے دوست کا بیٹا

۱۲۲

• ایک فائب

۱۲۶

• جشنِ حماقت

۱۵۲

• تھالی کا بھینگ

۱۶۰

• میرا دوست

۱۶۰

• بھینی بھینی بدلو

۱۶۸

• پرمیز

۱۸۶

• ہاتھ کی چوری

۱۹۶

• جگر گوشے

# کرشن چندر — آدمی ہی آدمی

مجتبیٰ حسین

کرشن چندر کے بغیر ادب پر سے ایک پورا سال بیت گیا، وقت بھلا کبھی رکنا ہے کرشن جی کی وہ معصوم مسکراہٹ جو ان کی کہانیوں کی طرح انہی کا حصہ تھی پچھلے سال کہیں دکھائی نہیں دی۔ ان کی پہلی برسی پر کتنی ہی یادیں ذہن میں تازہ ہو رہی ہیں۔ وہ اتنے بڑے ادیب تھے لیکن علی زندگی میں کسر نفسی اور انکساری کا پیکر تھے۔ ان کی انکساری میں ایک عجیب سا شرمیلپن تھا۔ ہر کام کرنے سے پہلے شرماتے تھے کوئی ان کی تعریف کرتا تو شرماتے تھے جھوٹوں سے ملے تو شرماتے تھے، بڑوں سے ملے تو تب بھی شرماتے تھے۔

ان کے ایک ہاتھ پر انگریزی میں ان کا نام بڑے حروف میں گدا ہوا تھا CHANDER KRISHAN میں نے ایک بار مذاق میں ان سے کہا تھا کرشن بھائی! یہ آپ نے اپنے ہاتھوں کو ڈرننگ کارڈ کیوں بنا رکھا ہے! اور پھر یہ بتائیے کہ جب آپ کا ایک ہاتھ مطبوعہ ہے تو دوسرے کو کیوں غیر مطبوعہ رکھا ہے اس پر بھی کچھ لکھیے بلکہ اردو میں لکھیے کیونکہ



آپ تو اردو کے ادیب ہیں۔ آپ کے ہاتھ پر اردو کو اس کا جائز مقام ملنا چاہیے۔ میری بات کو سن کر پہلے تو زوردار تہقہہ لگایا۔ پھر گھبرمو کر بولے "ہاتھ پر انگریزی میں نام لکھا ہو تو کیا ہوتا ہے۔ میرا ہاتھ تو اردو لکھتا ہے۔" اردو کے معاملہ میں فوراً گھبرمو جایا کرتے تھے۔

ان کے اس دستی وڑینگ کارڈ کی وجہ سے ایک زوردار لطیفہ بھی ہوا تھا، وہ جب دہلی آتے تو نظام الدین کے ہوٹل راج دوت میں ٹھہرتے۔ ایک رات میں اور کرشن چندر ہوٹل کے ڈائٹنگ ہال میں پہنچے تو دیکھا کہ نئی نسل کے کچھ نوجوان کاؤنٹر پر کھڑے شراب نوشی میں مصروف ہیں نوجوان نشے میں دھت تھے کرشن جی کاؤنٹر پر پہنچے تو ایک نوجوان نے قدرے جھک کر ان کے ہاتھ پر گدا ہونا نام پڑھا اور پھر اپنے دو ساتھیوں سے سرگوشی کے انداز میں بولا، دوستو ایک کرشن چندر تو وہ ہے جس نے گدھے کی آتم کتھا سرگزشت لکھی ہے اور ہمارے درمیان ایک ایسا کرشن چندر آیا ہے جو اس "آتم کتھا" کا سیر دے۔ نشے میں سرگوشی بھی کافی بلند ہو جاتی ہے کرشن جی نے جیسے ہی یہ جملہ سنا بے ساختہ تہقہہ لگایا۔ پیار سے اس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، نوجوان کے اس جملے سے میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی جی میں آئی کہ اس نوجوان کو اس بد تمیزی کا احساس دلایا جائے جب کرشن جی نے ہی دوسرا گال بھی غلام کے آگے پیش کر دیا تو بھلا میں کیا کر سکتا تھا تاہم میں نے نوجوان سے کہا: "برخوردار! تمہیں جس کرشن چندر کا انتظار ہے وہ ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ فی الحال تمہارے سامنے وہی کرشن چندر ہیں جنہوں نے گدھے کی آتم کتھا لکھی ہے۔" نوجوان نشے میں تو تھا ہی یہ سنتے ہی احساس ندامت کے بارے کرشن جی کے قدموں میں جھک گیا یہ دیکھ کر اس کے دوسرے ساتھی بھی کرشن جی کے قدم چومنے لگے ان کے منع کرنے کے باوجود یہ نوجوان نہ صرف ان کے پیچھونے میں مصروف تھے بلکہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھی رواں

ہو گئے تھے اتنے میں ایک غیر متعلق شرابی وہاں سے گزرا تو وہ بھی بلا سوچے سمجھے کرشن جی کے قدموں میں جھک گیا جب چرن چھو چکا تو ایک ہلکی لے کر بولا، آخر معاملہ کیا ہے؟ ان کے چرن کیوں چھوئے جا رہے ہیں؟ کیا یہ کوئی بہانہ ہے۔

میں نے کہا، ہاں ہاں ہاں ہاں سچ پچ بہانہ۔ تم کیا جانو یہ کیا ہیں؟ اس پر وہ پھر ایک بار کرشن جی کے چرنوں میں جھک گیا اور کرشن جی ان شرابیوں کی حرکتوں پر مسکراتے رہے وہ غصہ کرنا جانتے ہی نہ تھے نہ جانے ان کے پاس پیار کی اتنی ساری دولت کہاں سے آگئی تھی ہر ایک کی بھولی اپنے پیار سے بھر دیتے تھے۔

کھانے کے وہ بڑے شوقین تھے۔ چٹنی چیزیں بڑے شوق سے کھاتے تھے ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ ان کے قلب پر پہلے حملے کے بعد ڈاکٹر نے انہیں مصالطہ دار اور حکمی چیزیں کھانے سے منع کر دیا تھا۔ سلمیٰ آپا ر سلمیٰ صدیقی، ان پر گڑی نگرانی رکھتی تھیں کہ یہ کہیں کچھ کھا نہ لیں، ان دنوں وہ کھار کے، گونوا سس، والے مکان میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں چہل قدمی کرنے کی اجازت دے دی تھی، میں ان سے ملنے پہنچا تو سلمیٰ آپا سے اجازت لے کر میرے ساتھ چہل قدمی کے ارادے سے سڑک پر نکلے۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک آدھ فرلانگ کی چہل قدمی کے بعد واپس آئیں گے۔ اپنے گھر کے سامنے کی ساری سڑک عبور کی۔ دوسری سڑک پر سڑک را دھرا دھر دیکھا، اپنی جیب میں کچھ تلاش کیا۔ پھر مجھ سے بولے ”تمہارے پاس ایک روپیہ ہے؟“ میں نے کہا کرشن جی! بھلا ایک روپیہ کی کیا بات ہے؟ یہ سنتے ہی اپنی چہل قدمی کو تیز کر کے سڑک پر کھڑے ہوئے ایک ٹھیلے کے پاس پہنچے جہاں گرم گرم پکوڑے تل کر بیچے جا رہے تھے اور انہوں نے مشین کی سی تیزی کے ساتھ پکوڑے کھانے شروع کر دیئے اس وقت ان کے چہرے پر عجیب و غریب معصومیت کھیل رہی تھی میں نے ایسی معصومیت

کسی بڑے ادیب کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی جب کھا چکے تو جھ سے کہا: تم بھی کھانا  
چاہو تو کھالینا بہت اچھے بنے ہیں۔ مجھے ان کی سادگی پر سنسی آگئی واپسی پر بولے: خبردار  
سلے کو نہیں بتانا یہ عورتیں تو یونہی پریشان رہتی ہیں اور ماں بھٹی میں کتنے دن ٹھہرو  
گے: جب تک راتوں میں چپل قدمی کے لئے یہاں چلے آنا:

مہمان نوازی ان کا محبوب مشغلہ تھا، کوئی ملنے جاتا تو ان کے سامنے پھلوں کی پلیٹ رکھ  
کر خود پھلوں کو کاٹنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ سیب ایسی قفاست سے کاٹتے تھے کہ ایک  
جگہ چاقو لگا دیتے تو سارے چھلکے کو بیک جنبش قلم اتار دیتے تھے ان کو سیب کاٹتے دیکھنا بھی  
ایک انوکھی مسرت تھی۔ وہ ایک سیب کاٹ لیتے تو جی کہنے کو چاہتا تھا: بحان اللہ، مرجا  
مکرر ارشاد ہو، کیا فصاحت ہے، کیا بلاغت ہے۔

طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے کرشن جی کا رتبہ بہت بلند تھا اس لئے زندگی میں کہیں  
میں کوئی مزاحیہ صورت حال دکھائی دیتی تو اس میں وہ بڑی ڈیپ لیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۶ء میں  
جب وہ مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس کی صدارت کرنے کے لئے حیدرآباد آئے تو  
ہم لوگوں نے عملی مذاق کے طور پر سوچا کہ انہیں حیدرآباد کے مشہور مزاح کار حمایت اللہ کی مزاحیہ  
موٹر میں بٹھایا جائے اس پچاس سال پرانی موٹر کی خوبی یہ تھی کہ اس کی کوئی پھت نہیں  
تھی۔ البتہ پیسے تھے بیسیں بھی کہیں تھیں اور کہیں نہیں تھیں۔ اس موٹر کو بیک وقت تین  
چار ڈرائیورل کر چلاتے تھے ایک کے ہاتھ میں بریک ہوتا، دوسرے کے ہاتھ میں اسٹیرنگ  
وسیل تیسرے کے پاؤں میں ایکسپریٹر اور چوتھے کے ہاتھ میں مارن۔ میں نے کرشن جی  
سے کہا: کرشن جی ہم ایشیا کے عظیم افسانہ نگار کو ایشیا کی سب سے گھٹیا موٹر میں بٹھا کر جلسہ گاہ  
میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ سنس کر لوں گے اس موٹر کے ویلے سے اگر تم لوگ مجھے ایشیا کا



عظیم افسانہ نگار ماننا چاہتے ہیں تو چلو یہ خطرہ بھی مول لیتے ہیں "کرشن جی، سہلی صدیقی اور یوسف ناظم اس موٹر میں بیٹھ گئے۔ باقی جتنے لوگ تھے وہ سب کے سب ڈرائیور بن گئے۔ کوئی ڈپٹی ڈرائیور تھا کوئی اسسٹنٹ ڈرائیور اور ایک تو ہچک "بھی تھا کرشن جی اس موٹر میں بیٹھ کر اتنے خوش ہوئے کہ کتنی دیر تک ان کے چہرے پر یہ خوشی دکھتی رہی کرشن جی آخری زمانہ میں دہلی آنے سے بہت گھبرانے لگے تھے کہتے تھے ایک بار آیا تو بھانجہ ایک حادثے میں چل بسے، دوسری بار آیا تو بہندرناتھ گزر گئے۔ تیسری بار آیا تو سرلادیوی چلی گئیں۔ آخری مرتبہ وہ جولائی ۱۹۷۶ء میں ایک ہفتہ کے لئے دہلی آئے تھے یوں تو روزی ملتے تھے لیکن ۶ جولائی کو دوپہر میں مجھ سے کہا: "میں چاہتا ہوں کہ آج تم میری طرف سے اپنے دوستوں کو راج دوت پُرات کے کھانے پر بلاؤ۔" وقت بہت کم تھا۔ میں نکر تو نسوی، اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان کے پاس پہنچے ان کے چھوٹے بھائی آدم بھی تھے۔ بس یہی ان سے آخری ملاقات تھی۔ قلب پر دوشیدھلوں کے باوجود وہ زندگی سے سرشار تھے۔ ان کا ارادہ ایک انگریزی رسالہ نکالنے کا تھا۔ کہتے تھے میں تم لوگوں کی چیزیں انگریزی میں چھاپوں گا۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں ان کے قلب پر چو تھا حملہ ہوا اس سے ایک ہفتہ پہلے ان کا ایک خط ملا۔ قلب پر پے پے حملوں کے باوجود زندگی سے یوں نہیں ہوئے تھے ان میں جینے کا کتنا حوصلہ تھا ہم نے ایسے بھی روپ دیکھے ہیں جنہیں چینک بھی آتی ہے تو مصیبت ہائے لکھنے کو دوڑتے ہیں۔ احباب کو جمع کرتے ہیں۔ بیویوں کی چوڑیوں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے خود اپنے تعزیتی جلسوں کا خاکہ تیار کر دیتے ہیں۔ کرشن جی نے آخری سال تک اپنے پرلے دوستوں سے کبھی موت کی بات نہیں کی۔ انہیں اپنی موت کی بات کرنے کی ضرورت



بھی نہیں تھی کیونکہ کرشن جی نے اپنے قلم کے ذریعہ سدا زندہ رہنے کا اہتمام کر لیا تھا۔ ■  
 کرشن چندر جو ہمارا شعور ہے ہمارا ذہن ہے اور کرشن چندر کا وہ ناکپن جو ہندوستانی ادب  
 کا حصہ بن چکا ہے بھلا کہیں مر سکتا ہے۔

کرشن جی نہ صرف آنے والے برسوں بلکہ آنے والی صدیوں میں بھی زندہ رہیں گے  
 وہ اب ہمارے ادب کے افق پر ایک قوس قزح کی طرح تن گئے ہیں اور اس قوس  
 قزح کے نیچے سے ادب کے کاررواں گزرتے رہیں گے۔

## ماہر نفسیات

آجکلہ سُنّتے ہیں امریکہ نے علم نفسیات کے ماہروں کے انسانی علم کے خزانوں میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ دنیا میں انسانی امراض کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ محض انسانی دماغ کا وہم ہے۔ یعنی اگر آپ کو کوڑھ ہے تو دراصل یہ کوڑھ نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے دماغ کا وہم ہے کہ آپ کو کوڑھ ہے۔ اگر آپ کو لقوہ کی شکایت ہے تو یہ شکایت دراصل آپ کے دماغ کے غلط سوچنے کا نتیجہ ہے اور جس دن آپ کے دماغ سے یہ بات نکل گئی آپ کو کوڑھ یا لقوہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ہر مرض کو دماغ کی کسی جنونی کیفیت سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ ماہر نفسیات اکثر کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مریض کے دماغ کو ان مجنونانہ کیفیات سے خالی کرایا جائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم مریض کی جیبوں کو ضرور خالی کرایا جائے کہ اس کے بغیر کسی علم و فن کی تکمیل ناممکن ہے۔

مشہور امریکی ماہر نفسیات ڈاکٹر میک گرگری کا کہنا ہے کہ انسان کے امراض ہی نہیں اس کے حیات و جذبات اور فکری رجحانات بھی اسی قسم کے دماغی توہمات کا شکار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آپ غریبوں سے محبت کرتے ہیں تو دراصل یہ آپ کا وہم ہے آپ ان سے دراصل نفرت کرتے ہیں اور اس نفرت کو محبت کے پردے میں چھپا کر اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ نفرت محبت کی حس معکوس ہے۔ اگر آپ ہڑتال کر رہے ہیں تو بات دراصل یہ ہے کہ یہ آپ کا وہم ہے کہ آپ ہڑتال کرنی چاہتے ہیں۔ آپ ہڑتال اس لئے کر رہے ہیں کہ شعور کی تہوں میں کہیں یہ خیال آپ کے اندر چھپا ہوا ہے کہ آپ کیوں کام کریں آپ کیوں آرام سے نہ بیٹھ کر روٹی کھائیں اور دوسروں کو اپنا کام کرنے دیں۔ یعنی آپ ہڑتال اس لئے کرتے ہیں کہ آپ کے اندر سرمایہ پرست ذہنیت کام کر رہی ہے گویا اس طرح سے جو مزدور ہوتا ہے وہ اندر سے سرمایہ دار ہوتے ہیں اور جو سرمایہ دار ہوتا ہے وہ دراصل مزدور ہوتا ہے اور اگر اس کا لگے اور تجزیہ کیا جائے تو نہ کوئی سرمایہ دار ہے نہ کوئی مزدور ہے۔ یہ سب آپ کا وہم اور دماغی توتوس ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل امریکہ میں پاگلوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ بچوں جن امریکی ماہر نفسیات کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ انسانی شعور کے اندر نت نئی مجنوناہ کیفیات کا پتہ چلتا جاتا ہے۔ ایک روز امریکی ماہر نفسیات اس بات کا پتہ بھی چلا لیں گے کہ انسانی جنون کے سوا کچھ بھی نہیں اور یہ ایٹم بم کے بعد دوسری دریافت ہوگی۔ جس سے امریکی طرز معاشرت کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ ڈاکٹر میک گرگری نے اس تھیوری کی بنا پر انسانی محبت کو جنون کی ایک کیفیت قرار دیا ہے۔ انہوں نے ایک سفوف بھی ایجاد کیا ہے جسے پانی میں گھول کر پیتے ہی انسان کے دل سے محبت کا نور بر جاتی ہے۔ پسیلین کے بعد دوسری بڑی دریافت ہے۔ جو

امریکی طب سے ایجاد کی ہے۔ سنا ہے کہ یہ سفوف ساری امریکی آبادی کو کھلایا جائے گا اور امریکی گورنمنٹ کے صدر ٹرومین اس میں بذات خود بڑی دلچسپی لے رہے ہیں بلکہ سب سے پہلے یہ سفوف خود انہوں نے اور مسٹر مارشل نے چکھا تھا۔ اس کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے ہیں۔ اس لئے اب پوری امریکی آبادی پر اس کا تجربہ کیا جا رہا ہے تاکہ دوسرے خطرناک امراض کی طرح انسانی محبت کی روک تھام بھی کی جاسکے۔ چھوٹی عمر کے امریکی بچوں کے لئے اس سفوف سے ایک ٹیکہ تیار کیا گیا ہے۔ جوان کے پیدا ہوتے ہی لگا دیا جائے گا اور چھپکے کے ٹیکہ سے بھی پہلے لگا دیا جائے گا۔ کیونکہ امریکی ڈاکٹر کا خیال ہے کہ یہ مرض کوڑھ، تپ، دق اور سرطان سے بھی زیادہ ہلکا ہے اور اگر کہیں اس مرض نے امریکہ میں وبا کی صورت اختیار کر لی تو اس کا اثر پوری امریکی زندگی، اس کی معاشرت، سیاست اور معیشت پر بھی پڑے گا۔ وال سٹریٹ کے بینکروں نے پچاس ارب ڈالر کی رقم سے ایک کارخانہ قائم کیا ہے جہاں اس سفوف کو تیار کیا جائے گا۔ اور ایک تجویز یہ بھی ہے کہ صرف امریکی عوام کا ہی بھلا کیوں ہو۔ دنیا بھر کے لوگ اس سفوف سے محروم کیوں رکھے جائیں چنانچہ یہی سوچ کر امریکی نمائندے نے یو۔ این۔ او میں ایک تجویز کو رکھا کہ دنیا بھر کے عوام کو یہ سفوف چٹایا جائے۔ لیکن حسبِ عادت روسی نمائندے نے اپنے ویٹو سے کام لے کر اس تجویز کو رد کر دیا۔ یو۔ این۔ او کی اکثریت جس میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ اس تجویز کے حق میں تھی۔ صرف ایک ایسی بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ روس کس طرح جمہوریت کا دشمن ہے اور اپنے ویٹو کو اتنا ہی بیہودہ کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہاں اپنے مضمون کو صرف سائنسی معلومات تک محدود



رکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ سمجھتا ہوں کہ سائنس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔  
 میں علم طب کی بات کر رہا ہوں۔ اس سے مجھے مشہور امریکی جراح مسٹر قل۔ قل ڈوٹیل کی  
 حیرت انگیز جراحی کا خیال آیا ہے۔ امریکن فن جراحی نے قل۔ قل ڈوٹیل اور ان کے دوسرے  
 ساتھیوں کی مدد سے بہت ترقی کی ہے ایک شخص کی آنتڑیاں نکال کر دوسری آنتڑیاں  
 ڈال دی گئیں۔ ایک آدمی ایسا ہے جس کا معدہ نکال دیا گیا ہے اور وہ صرف آنتڑیوں میں  
 جانے والی غذا کے سہانے جی رہا ہے۔ ایک آدمی کے دل کا غلیظ حقہ نکال کے پھینک  
 دیا گیا اور اس کی شہ رگ کو تبدیل کر دیا گیا اور ایک آدمی کا پیچڑا کاٹ کے دماں  
 لوہے کی ٹنگل لگا دی گئی ہے۔ جو خود سانس اندر کھینچتی ہے اور باہر نکالتی ہے اور انسانی  
 پیچڑے کی طرح مختلف گیسیں پیدا کر کے خون کو صاف کرتی ہے اور تنفس کو جاری  
 رکھتی ہے۔

امریکن فن جراحی کے کمالات کیا بیان کروں۔ یہ ڈاکٹر لوگ آپ کے بد صورت  
 کان کاٹ کے آپ کو نئے کان عطا کر سکتے ہیں۔ نئی ناک دے سکتے ہیں۔ نئے ہونٹ  
 بنا دیتے ہیں۔ آپ کے سر پر بال اُگا دیتے ہیں یہ لوگ ایسا کر سکتے ہیں کہ آپ آنکھوں  
 سے سن سکیں۔ کانوں سے دیکھ سکیں۔ ناک سے چھو سکیں اور زبان سے سونگھ سکیں۔ ان  
 میں سب سے زیادہ حیرت انگیز معجزہ جان حبشی کے سلسلے میں ہوا ہے۔ جان حبشی کا رنگ  
 کالا تھا۔ ڈاکٹروں نے انجکشن کے ذریعے سے اس کے رنگ کو گورا کر دیا۔ اس کے موٹے  
 ہونٹ پتلے کر دیئے۔ اس کے گتھرے سیاہ بالوں کو سیدھے سادھے سنہری بالوں  
 میں تبدیل کر دیا اور اس کے آگے بڑھے ہوئے جڑے کو اس طرح گھما دیا کہ اب اس  
 کا چہرہ بالکل بیوقوف معلوم ہوتا ہے۔

یہ سب کچھ تو ہوا۔ حبشی کا رنگ گورا ہو گیا۔ لیکن اس کی تیلوں بھٹی ہوئی ہے۔ اس کی ناک پہلے سے کہیں خوبصورت ہو گئی ہے۔ لیکن اس پاؤں میں جوتا نہیں ہے۔ اس کا جیڑا گھوم کر ٹھیک بیٹھ گیا ہے۔ لیکن اس جیڑے کے اندر گندم کا ایک دانہ نہیں گیا ہے۔ امریکی ڈاکٹروں نے دل کا ایک غلیظ حقہ تو کاٹ کے پھینک دیا ہے۔ لیکن وہ دل کی غلاظت کو نہیں نکال سکے۔ انہوں نے شہرگ کو تبدیل کر دیا ہے۔ لیکن اس کے اندر نیا خون نہیں نکال سکے۔ انہوں نے ایک لوبے کا پھیپڑا تو ایجاد کر دیا۔ لیکن سماج کے تنفس کو ٹھیک نہیں کر سکے۔ انہوں نے ایک آدمی کے جسم کو تبدیل کرنے میں اتنی ساری کاوشیں صرف کر دیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم کی روح سکر کر رہ گئی۔ وہ ایک ایٹم بم کو توڑ دینے کی فکر میں ہیں۔ دو ایٹموں کو ملا کر ایک نئی بہتر طاقت کو وجود میں لاتے کے خلاف ہیں مگر میں پھر سیاست میں بہک چلا۔ بھلا سیاست اور سائنس کا آپس میں کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک معذوب کی بڑ ہے۔ شاید مجھے بھی ایک ماہر نفسیات کی ضرورت پڑے گی۔

سنتے ہیں کہ اب امریکی ماہرین نفسیات نے فیصلہ کیا ہے کہ تمام تکلیفوں کا واحد منبع انسان کا دماغ ہے۔ یہ دماغ سوچتا ہے۔ حرکت کرتا ہے کام کرتا ہے اور اسی سے تمام سمجھنیں زندگی میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ آج کل یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر انسانی کھوپڑی سے دماغ کو نکال کر اس میں بھوسہ بھر دیا جائے تو کیسا رہے؟ مگر سننا ہے کہ روس پھر اس کی مخالفت کرے گا۔

# ایک لڑکی بگھارتی ہے وال

ایک لڑکی بگھارتی ہے وال، اسماعیل میرٹھی نے کہا ہے۔ مگر یہ فقہ پرانے زمانے کا ہے جب لڑکیاں واقعی وال بگھاتی تھیں۔ آج کل تو وہ صرف شیخی بگھارتی ہیں۔ کہتے ہیں پرانے زمانے میں وال اتنی سستی ہوتی تھی کہ نہ صرف کھائی جاتی تھی بلکہ جوتیوں میں بھی بیٹی تھی۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ اس زمانے میں دتی کے گلی کوچوں کے باہر سرشام گداگرا نقوں میں سلیم شاہی جوتیاں لئے کھڑے رہتے تھے اور آوازیں نکالتے تھے وال بٹوالو۔ جوتیوں میں وال بٹوالو آج کل سلیم شاہی جوتے کون پہنتے ہیں۔ اس لئے وال چٹپوں میں بیٹی ہے اور بڑی مشکل سے ملتی ہے۔

وال بگھارتے کا من بھی اصلی گھی کے ساتھ عنقا ہو گیا اپنے بچپن کا زمانہ یاد کیجئے۔ جب اصلی وال پر کڑکراتے ہوئے اصلی گھی میں لہسن یا پیاز کا بگھار دیا جاتا تھا جس کی خوشبو پتے محلہ سوئی والاں سے ہمارے کے والاں تک پھیل جاتی تھی۔ شاید کچھ اور مصالحے بھی پڑتے ہوں گے کیوں کہ بزرگوں سے سنا ہے کہ واجد علی شاہ کے زمانے میں شرف نام کا ایک باورچی

شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باورچی تھا۔ پوچھا گیا کیا پکاتے ہو بولا: صرف دال پکاتا ہوں اور ایک کٹوری دال کے لئے ایک سواشرنی لیتا ہوں۔“

واجد علی شاہ بولے: ”میاں دال۔ آخر تو دال ہی ہے۔ ایک کٹوری دال کے ایک سواشرنی کیا معنی؟“

عرض کیا: جہاں پناہ۔ دالیں تو سب ہی ایک سی ہوتی ہیں۔ کیا مونگ، کیا مسور، اصل چیز تو بگھا ہے۔ اس کے ایک سواشرنی لیتا ہوں: شرف کو ٹرائیل پر رکھ لیا گیا۔ رات کو جب بارہ دری میں دسترخوان بچھا تو شاہ کے لئے ایک کٹوری دال بھی موجود تھی۔واجد علی شاہ نے دال چکھی۔ فرمایا: ”مزے میں خوب ہے لذیذ اور عمدہ ہے۔ مگر اس ایک کٹوری دال کے لئے ایک سواشرنی؟ کچھ سمجھ میں آیا۔“

شاہ نے دال کے دو تین تھے چکھ کے کٹوری الگ رکھ دی۔ شرف نے آہستہ سے وہ کٹوری شاہی دسترخوان سے کھسکالی اور اسے بارہ دری کے قریب ایک روش کے کنارے انار کے ایک سوکھے پیڑ پر ڈال کر چلا گیا۔

صبح جبواجد علی شاہ چمن کی سیر کو نکلے تو دیکھا کہ روش کے کنارے سے انار کا سوکھا ہوا پیڑ ہرا ہو چکا ہے۔ فوراً شرف کو طلب کیا مگر شرف رات ہی سے غائب ہو چکا تھا۔ پھر کبھی نہیں نظر آیا۔

اللہ اللہ ایک وہ دال پکانے والے باورچی تھے اور ایک ہمارے دوست خواجہ احمد عباس ہیں کہ ادیب، فلم ساز اور صحافی ہونے کے علاوہ باورچی ہونے کا بھی دم بھرتے ہیں اور ایسی عمدہ دال پکاتے ہیں۔ ایسی عمدہ دال پکاتے ہیں کہ ہرے بھرے پیڑ پر ڈال دو پانچ منٹ میں سوکھ کر ٹھنڈ ہو جائے گا۔



وال کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ حیدر آبادی وال۔ کہ مزے میں تڑش بلکہ طنز آمیز معلوم ہوتی ہے۔ مخصوص بگھار کے ساتھ اعلیٰ قسم کے چاول کے ساتھ کھائیے طبیعت مفرح ہو جاتی ہے اور جی بے اختیار کسی کی ٹانگ گھسیٹنے کو چاہنے لگتا ہے۔ حیدر آباد میں مزاج نگاروں کی کثرت کا وہ یہی کٹھی وال ہے۔ میں خود جب اپنے ذہن میں مزاج کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ فوراً چند دن کے لئے حیدر آباد کا رخ کرتا ہوں۔ البتہ حیدر آبادی مزاج نگاروں کے لئے سال میں حیدر آباد کے چار چکر لگانا ضروری ہیں۔ ورنہ بور بور کر یوسف ناظم صاحب کی طرح سنجیدہ شاعری پر اتر آتے ہیں۔

یوپی کی وال۔ بالعموم ارہر کی ہوتی ہے۔ اور اگر ارہر کی نہ ملے تو جو دوسری وال ملے گی وہ بھی ارہر ہی کی ہوگی۔ ارہر کے کھیت کو یوپی کے کلچر میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو سیب کے پیر کو کشمیر میں یا ناریل کے پیر کو کیرالا میں۔ ارہر کی وال میں ایک ہلکی ہی باندھ ہوتی ہے اور کہیں پر ایک ہلکی سی تلخی بھی، مجھے ارہر کی وال بالکل پسند نہیں مگر ابھی معصوم رضا کو بہت پسند ہے۔ آپ انہیں دعوت پر بلانے کے لئے مرغ و ماہی کا ذکر کریں، کہاں اور قورے کا لالچ دیں۔ انکار کر دیں گے۔ ہاں ارہر کی وال کا ذکر کیجئے تو آپ کی دعوت میں بلا تکلف بلکہ بن بلائے بھی چلے آئیں گے۔ کچھ دوستوں کے خیال میں میرے اور راہی کے درمیان بناؤ نہ سازا اردو ہندی کا جھگڑا ہے۔ جی نہیں۔ صرف ارہر کی وال! ارہر کی وال میں اور کوئی سنو بی ہو نہ ہو۔ یہ خوبی تو ضرور ہے کہ اسے کھاتے ہی گونگے سے گونگا آدمی بھی بے تکاں بولنے لگتا ہے اور مطالب اور معافی سے بے نیاز بولتا ہی چلا جاتا ہے۔ پوسے یو۔ پی میں یہی وال کھائی جاتی ہے۔

سانہر کی وال۔ جو لوگ سانہر کا شکار کر چکے ہیں۔ کہیں مقابلے میں نہ رہیں۔ اس

میں گوشت بالکل نہیں پڑتا۔ یہ جنوبی ہند کی مرغوب ترین دال ہے۔ معلوم نہیں کس دال سے پکاتے ہیں۔ کیونکہ اس میں دال کا نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ البتہ لوکی بیگن، پیاز اور کدو کے ٹکڑے ضرور ہوتے ہیں۔ اسے بالعموم اڈلی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ اسے کھاتے ہی ذہن کلر کی طرف مائل ہوتا ہے زیادہ کھاؤ تو بھارت ناٹیم کی طرح تھرکنے لگتا ہے۔

گجراتی دال کچھ دالیں کھانے کے لئے ہوتی ہیں۔ گجراتی دال پینے کے لئے ہوتی ہے۔ اس میں گڑ بھی ڈالتے ہیں اور مک بھی اور دودھ بھی اور پسے غالباً ارتڈی کے نیل کا بگھار دیتے ہیں اور پیاز اور لہسن سے ڈور رکھتے ہیں۔ پہلی بار جب اس دال کی کٹوری میرے سامنے آئی تو میں نے آہستہ سے چمچ چلا کر ٹٹولا کچھ پتہ نہ چلا کون سی دال ہے۔ پھر انگلی پھیر کر معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ ناچار نیچر سپن کر کٹوری میں اتر گیا۔ گھنٹہ بھر کی تساوری کے بعد پیندے میں دال کا ایک دانہ بل گیا۔ معلوم ہوا اس دال میں دانہ کم ہوتا ہے۔ پانی زیادہ۔ آب و دانہ کی ترکیب غالباً اسی گجراتی دال نے سنبھالی ہے۔ پھر وہ جملہ بھی یاد آیا۔ ”دلنے دلنے پر لکھا ہے کھانے کا نام۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گجراتی دال کی ہر کٹوری میں پتلے شوربے کے ساتھ دال کا ایک دانہ ڈال دیا جاتا ہے اور دانے سے پہلے اس پر مہان کا نام بھی چھاپ دیا جاتا ہے یا چپکا دیا ہے۔ تبس پر میں نے صبر کیا اور کٹوری اٹھا کہ دال کا سارا پانی پی لیا اور یہ سوچ کر صبر کہ لیا کہ اپنے حقے میں یہی دانہ پانی مقسوم تھا۔

کسی نہ کسی شکل میں یہی دال گجرات کے علاوہ بہار، اڑیسہ اور کرناٹک میں بھی رائج ہے۔ ہم ہندوستانی نہ صرف یہ کہ خود ہی دال کھاتے ہیں بلکہ اپنے کھلاڑیوں کو بھی یہی دال کھلاتے ہیں۔ اور اس کے بعد متعجب ہوتے ہیں کہ ہمارے کھلاڑی اولمپک گولڈ میڈل کیوں نہیں حاصل کرتے؟ کرکٹ کے ٹسٹ میچ کیوں نہیں جیت سکتے؟ ہاکی کے میدان

سے فتح کے جھنڈے لہراتے ہوئے کیوں نہیں آتے! کچھ لوگ یہ بھی سوچنے لگے ہیں کہ اگر ہم ان کھلاڑیوں کی جگہ اپنے مویشی کھیل کے میدان میں بھیجیں تو وہ زیادہ تو مندری کا مظاہرہ کر سکیں گے راوی اپنی رائے محفوظ رکھتا ہے۔

پنجابی دال۔ جیسا میں نے کہا ہے۔ کچھ دالیں کھاتے کے لئے ہوتی ہیں، کچھ پینے کے لئے، پنجابی دال کو۔ چنانا پڑتا ہے۔ اس قدر گاڑی ہوتی ہے کہ آپ چاہیں تو اسے چھری سے کاٹ سکتے ہیں گاڑی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کالی بھی ہوتی ہے۔ چاہے ثابت ماش کی دال ہو یا چھوٹے کی دال، اگر آپ کو کبھی امرتسر سے کھلتے تک گرانڈ ٹریک روڈ سے سفر کرنے کا موقع ملے تو راستے میں آپ کو جگہ جگہ پنجابی ڈھلے ملیں گے جہاں یہ کالی دال بکثرت ملتی ہے اور اس قدر لذیذ ہوتی ہے کہ بیشتر اس کے کہ آپ کچھ پناہ ساتھ رکھیں آپ دور وئی تنور کے ساتھ چار کٹوری والی کھانچے ہوتے ہیں جو اس عمل کے دو گھنٹے کے بعد معدے کی وہ حالت ہوتی ہے کہ جی چاہے تو گوبرگیس پلانٹ لگا لیجئے۔ ہفتوں کام دے گا۔

انسان کی طرح دال کے بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ مونگ اور چنے کے بونٹ کی دالیں ہرے رنگ کی ہوتی ہیں۔ ارہر کی دال پیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ بوبیئے کی دال لال رنگ کی ہوتی ہے۔ دونوں کو ملا کر کھلائیے تو آدمی غصے سے لال پیلا ہونے لگتا ہے۔ میں نے کچھ شبیوں کے ہاں بے حد سرخ رنگ کی دال بھی دیکھی ہے۔ جیسے ہمارے دوست اور اشتراکی شاعر نیا زحید بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ سنسہ اس دال کے کھاتے ہی اشتراکیت کے سارے رموز و اسرار چشم زدن میں آشکار ہو جاتے ہیں ان دالوں کے رنگ میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ اگر ان میں کچھ کالا کالا پڑ جائے تو فوراً

دکھائی دینے لگتا ہے۔ جرات کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

مُنہ پر بکھرے بال ہیں سب اور ٹوٹا کان کا بال ہے

ہم نے تو معلوم کیا کچھ دال میں سب کا کالا ہے

یہ دال میں کالا کالا کی ترکیب کسی غیر پنجابی لغت دان کی ایجاد ہے ورنہ پنجابی دال

میں تو سب کچھ کالا کالا ہوتا ہے۔

ہمارے زمانے میں اردو کی پہلی کتاب میں پنڈت جی کی پہلی ہوتی تھی اور مولوی

صاحب کا گھوڑا ہوتا تھا۔ جب عمر میں ذرا آگے بڑھے تو شریک ہندوؤں نے اس شر کو طحاوا

دیا۔ اب ہندوؤں کی لٹیا تھی۔ مسلمانوں کا ٹٹا، ہندوؤں کی دعوتی تھی، مسلمان کا تہمد، ہندوؤں کی

رسوئی تھی۔ مسلمان کا باورچی خانہ! ہندوؤں کی دال تھی۔ مسلمان کا گوشت۔ اسی کی، کا کی جنسی

اشاریت اور فرقے واریت نے ملک کا بٹوارہ کر دیا۔ اس وقت کسی نے نہ سوچا کہ ایک دن ایسا

بھی آئے گا جب اس برصغیر میں کتے کا گوشت تیرہ روپے کلو بکنے لگے گا۔ اب کیا ہندو

کیا۔ مسلمان سب ہی دال کھاتے ہیں اور کی، کا کی بحث سے کتراتے ہیں۔

اسی کی، کا کی بحث میں ان دنوں اردو ہندی کا جھگڑا بھی زور پکڑ گیا تھا کچھ لوگ

کہتے تھے گئے کہ ہندی صرف ہندوؤں کی زبان ہے اور اردو صرف مسلمانوں کا تصرف

جائزہ ہے۔ آج کل بھی ایسے سرمچھروں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

در اصل کسی زبان کی ماہیت، ماحول، اور مزاج کو سمجھنے کے لئے اس کے محاوروں کے

چلن کو بھی سمجھنا پڑتا ہے اور اس امر سے تو ہر کوئی واقف ہے کہ بوشے زیادہ سے زیادہ

استعمال میں آتی ہے۔ وہی محاوروں اور اس زبان کی ترکیب میں شامل ہوتی ہے۔

اب آپ اردو کی کوئی سی لغت اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو دال زوٹی کا محاورہ ملے



گا۔ وال گوشت کا نہیں۔ وال دلیہ کا ذکر ملے گا۔ وال قورمے کا نہیں۔ لوگ وال نے عین بولتے ہیں۔ گوشت نے عین کوئی نہیں بولتا۔ بس اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ ارد و صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ سارے ملک کی زبان ہے۔

تادمے سے پہلے مجھے وال بگھارنے سے وال گلے کا ذکر کرنا چاہیے تھا اور یہ کوئی آج کی بات نہیں۔ شروع ہی سے سنتے آئے ہیں کہ وال نہیں گلتی۔ غریب کی امیر کے سامنے نہیں گلتی۔ امیر کی حاکم کے سامنے نہیں گلتی۔ مگر میرا تجربہ کہتا ہے کہ وال بہ آسانی گل سکتی ہے بشرطیکہ آپ اپنی وال کو خوشامد کی دھیمی دھیمی آہنیچ پر پکائیں اور کسی چمچے کی مدد سے بار بار ہلاتے جائیں۔ بلکہ اگر ہر کے تو خود ہی چمچ بن جائیں۔ اس کے بعد بھی اگر وال نہ گلے تو اپنی دیکھی کے گرد کسی صاحب ثروت کا نعینہ باندھیں۔ اس پر بھی وال نہ گلے تو کسی معروف وال گلیتے سے رجوع کریں۔ آج کل ہر چھوٹے بڑے شہر میں آپ کو ایسے وال گلیتے مل جائیں گے جو سکھ راج کے وقت مناسب تعداد میں نہ کر ہر قسم کی وال گلا سکتے ہیں۔ آزمودہ ہے۔ سنتے ہیں کہ تعلق کے زمانے میں جب ایک افغان سردار بہ سلسلہ ملازمت برائستہ خیبر ہندوستان وارد ہوتا اور جب یہاں اس نے ہر کسی وناکس کو وال سے روٹی کھاتے دیکھا تو حیرت میں رہ گیا بولا "خو، تم کیسا جنگلی لوگ ہے۔ زماج کو اناج سے کھانا ہے؟ اس پر کسی نے اسے جواب دیا: "تم اناج کا ذکر کرتے ہو یہاں آدمی کو آدمی کھا جاتا ہے اور کسی کو حیرت نہیں ہوتی۔"

اس پر وہ افغان سردار مایوس ہو کر اپنے وطن لوٹ گیا تقریباً اسی زمانے میں سنا ہے مولانا حافظ رحمت علیہ بھی تشریف لائے تھے اور کسی سرائے میں ٹھہرے۔ سرائے کی شوخ چشم بھٹیاریں نے انہیں ایسی عمدہ وال پکا کے کھلائی کہ عیش عیش کراٹھے اور جلتے جلتے

سمرقند و بخارا کی دونوں ولایتیں اسے بخش گئے

حافظ کا وہ مصرعہ تو آپ نے سنا ہوگا۔

یہ دال ہندوش بخشتم سمرقند و بخارا را

کچھ تنگ نظر لوگ یاں دال کے بجائے خال کا ذکر کرتے ہیں، یعنی یہ دال ہندوش

بخشتم کی جگہ بخال ہندوش بخشتم پڑھتے ہیں۔ مگر یہ حافظ کے ساتھ سراسر بے انصافی ہے

کیا حافظ نے ایرانی گلغداروں کے خال نہیں دیکھے تھے جو یہاں کے خال پر حال میں

آجاتے۔ یقیناً یہاں دال ہی کا ذکر ہے۔

مگر یہ وہ زمانہ تھا جب ادھر کے لوگ ادھر نہیں جاسکتے تھے۔ اب صورت حال

بدل چکی ہے۔ چنانچہ جب میں ہسپتالگر کی کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوا تو چھو چا اس گم نامی

کی زندگی میں پڑے رہنے سے کیوں نہ سمرقند اور بخارا جایا جائے جو مولانا حافظ ہیں  
بخش گئے ہیں۔

خیر کسی نہ کسی طرح سمرقند پہنچے۔ مگر کسی تے نوٹس ہی نہ لیا۔ بخارا گئے۔ وہاں

بھی یہی حال ہوا۔ ہم نے حافظ کے شعر کا سوالہ دیا تو بولے۔ آج کل سمرقند اور بخارا

دونوں سوویت روس کی تحویل میں ہیں۔ میں نے کہا: مگر مولانا حافظ تو ہمیں بخش

گئے ہیں۔ یقین نہ آئے تو ویسی ہی دال پکا کر دکھا دیں: وہ بولے: "میاں دال"

کوئی کھاتا ہی نہیں۔ اس پر ہم کچھ چراغ پا ہوئے۔ وہ لوگ سیخ پا ہوئے۔ آخر

ہم کہہ دن چھکا کر خاکپا ہوئے

سوچ لیا۔ آئندہ کسی شاعر کا اعتبار نہیں کریں گے، اگر وہ سمرقند کے بجائے

شکر قند اور بخارا کی جگہ آلو بخارا ہی ہمیں نہ بخش دے ہم کبھی اعتبار نہ کریں گے۔

## سوال و جواب

۱۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ کو دوسروں کی دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔  
اپنی دال میں نہیں۔؟

جواب کے لئے بغلیں جھانکیے۔

۲۔ دال دیکھ۔ دال کی دھار دیکھ۔ کس قسم کی دال کے لئے استعمال ہوتا ہے۔  
اور کیوں؟۔ جن طالب علموں کے پاس تیرنے کی سند موجود نہ ہو جواب  
دینے کی کوشش نہ کریں۔

۳۔ دال گلنے کے طریقے بتائیے۔ اگر ان طریقوں کے استعمال سے آپ کے ساتھ  
آپ کا ضمیر بھی گل جائے تو آپ کیا کریں گے؟۔ ویسے اس سوال کا صحیح حل  
میرے پاس بھی موجود نہیں ہے۔

## ایک دوست کی موت پر

پہلے سے ارجب میں نے اسے دیکھا تو وہ کا پنخ کے ایک خوبصورت دریچے کے پیچھے کھڑا سو کر بڑے باوقار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اسے میں نے پسند کر لیا کیونکہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں اپنے آپ کو پسند کرا لیتے ہیں۔ وہ بالکل لانا سیدھا کسی تربیت یافتہ فوجی نوجوان کے انداز میں کھڑا تھا۔ کندنی رنگ، گول چہرہ چیتے کی سی تیلی کمر اور مضبوط دھڑ سے اس کی وجہ شخصیت کا اندازہ کرتے ہوئے میرے دل میں بے اختیار ہاس کے لئے ایک گہری کشش محسوس ہوئی کہ میرا دل اس سے ملاقات کرنے سے جانتے پہچانتے اسے اپنا دوست بنانے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ ہاس کی شخصیت میں سب سے اہم اس کے بال تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے باوقار مردانہ چہرے پر ایسے خوبصورت بال نہیں دیکھے۔ اس کے سر کے بال گہرے سنہرے تھے ایسے گھنے اور ملائم گویا ریشم کے پچھے اس کی مغز اور مسکراہٹ دیکھ کر مجھے احساں



ہوا جیسے اسے بھی اپنے خوبصورت بالوں کی اہمیت کا احساس ہے۔ اس کے بال دیکھ کر میرا جی چاہا کہ میں ان میں انگلیاں پھیروں انہیں اپنے گالوں سے لگا لوں انہیں چوم لوں ان میں ڈوب جاؤں۔ میں بے اختیار کاناچ کا بڑا دردناک کھول کر اس سے ملنے کے لئے اندر چلا گیا۔

اب تو سرور میری اس سے ملاقات ہوتی ہے اور میں سرور دڑ بڑے پیار سے اس کے بالوں پر ماتھ پھیرتا ہوں اس کی دیشمیں زلفوں سے کھیلتا ہوں کبھی ان سے اپنی ٹھوڑی گدگداتا ہوں، کبھی اپنے گال کبھی اس کا سر پانی سے جھگو دیتا ہوں، کبھی اسے تولیے سے پونچھ کر صاف کر دیتا ہوں اور میرا دوست اب میری کسی حرکت پر معترض نہیں ہوتا کیونکہ وہ میرا شیوگ برش ہے شروع کے چند دنوں میں وہ مجھ سے کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہا اس کے بال مجھے چھتے تھے۔ میری انگلیاں اس کی بتی، اسے پھسل جاتی تھیں، کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرے رخساروں سے چھوتے ہی اس کا مارا بدن مجھ سے بغاوت کر رہا ہے اپنی شخصیت کی حفاظت پر تل گیا ہے مگر ہر نئی دوستی اور رفاقت میں یہی ہوتا ہے۔ شروع شروع میں نئے دوست ایک دوسرے کو جانچتے ہیں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں ایک دوسرے کے قریب آتے آتے بھی اپنی ذات کو بچانے پر مجبور ہوتے ہیں مبادا کہ ان کی شخصیت مجروح ہو جائے دوستی میں ایک باؤ تانہ توازن اور فاصلہ رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں، ہر نئی دوستی میں یوں ہی ہوتا ہے، سرور کی وہ منزل بہت دور ہوتی ہے جب توازن ٹوٹ جاتے ہیں فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ فاصلے مٹ جاتے ہیں اور جھجک غائب ہو جاتی ہے اور ایک آدمی دوسرے آدمی کو سمجھتے ہوئے بے جھجک اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دینے پر تیار ہو جاتا ہے اور اپنی

روح کے سارے دروازے اپنے دوست کے لئے کھول دیتا ہے یہ منزل سمجھ کی اور سپردگی کی، ایک دوسرے میں ڈوب جانے کی بہت دیر میں آتی ہے۔ اس کے لئے وقت چاہیے اور دل کا درد اور وہ لذت آشنا کیفیت جو کچھ پانے سے نہیں بلکہ کچھ کھونے سے پیدا ہوتی ہے اس لئے شروع شروع میں وہ مجھ سے کچھ اکھڑا رہا۔ کبھی اس کے بال مجھے چھتے، کبھی بار بار بھگونے سے بھی اس کے بالوں میں نرمی نہ آتی۔ بار بار رگڑنے سے بھی رخساروں پر وہ بھاگ نہ آتا جس کی مجھے توقع تھی اور میں سوچنے لگا کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی اسے پانے میں، اسے اس قدر اپنے قریب لانے میں؟ ہر نئی دوستی کے شروع میں کچھ ایسا ہی عسوس ہوتا ہے۔ جیسے آپ مغائرت کی دیوار کو گھونسا مار رہے ہیں اور وہ دیوار نہیں ٹوٹتی اور دوسرے فریق کی مدافعت کی وجہ سے نہیں ٹوٹتی۔ جیسے اس دوستی کو آگے بڑھانے میں آپ کا کوئی تصور نہیں ہے صرف دوسرے فریق کا قصور ہے۔ ہر آدمی اپنے اعتقادات، خیالات اور اندھی عرض سے اس قدر بندھا ہوتا ہے۔ کہ دیوار کی دوسری طرف نہیں دیکھ سکتا۔ دوستی کے پہلے دن اس ہوا کی طرح ہوتے ہیں جو گرم گھٹی راتوں میں نمائش روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور شبینم کی پہلی بوند یا پھولوں کی پہلی خوشبو کا انتظار کرتی ہے۔

اپنی دنوں ایک دن میں نے غصے میں اگر شیونگ برش کو نیچے زمین پر بیٹھ دیا، زمین پر گرتے ہی برش ہاتھ روک کے سفید اور سخت ٹائٹوں سے ٹکرایا اور لڑھکتا ہوا اس گندی آہنی جالی پر جاگرا جس کے نیچے گندی موری بہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ دھڑکے قریب اسے چوٹ آئی ہے کمر کے قریب ایک جگہ سے اس کا سنہرا پالش اتو گیا ہے اور اس کے سنہرے بال صابن کے سفید سفید بھاگ میں تھڑے ہوئے آہنی جالی کے کوڑے میں غلیظ ہو چلے

ہیں۔ سفید سفید بھاگ والے ٹیلونگ برش کو یوں گندگی میں گرنا دیکھ کر مجھے شرمندگی کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے کسی صاف ستھرے دھلے دھلائے بچے کو اٹھا کر کسی گندی موری میں پھینک دیا ہو۔

جلدی سے بڑھ کر میں نے اپنے ٹیلونگ برش کو زنگ آلود آہنی جالی سے اٹھالیا اور دیوار گیر شک کی ٹوٹی کھول کر اسے دھونے لگا۔ اسے ٹوٹی کے زوردار کھلے پانی کے نیچے رکھ کر میں اپنے ہاتھوں سے اس کی حفاظت دھونے لگا۔ جو میری ہی دی ہوئی تھی میں نے بار بار اس کا سر پانی سے دھویا۔ بار بار صابن لگایا اور دھویا اور جب برش خوب اچھی طرح صاف ہو گیا تو میں نے بڑی احتیاط سے اسے تولیے سے پونچھا۔ اس کا سر خشک کیا اور پھر اس کے بالوں میں ہاتھ پیرنے لگا تو مجھے ایسا احساس ہوا جیسے اس کے بال انتہائی نرم اور ملائم ہو چکے ہیں اور پھر میں نے دیکھا کہ جب میں اس کے بال دائیں اور بائیں گھماتا ہوں تو سخت اور کھردرے معلوم ہوتے ہیں۔ یکایک مجھے اپنی قلعی کا احساس ہوا اور معلوم ہوا کہ اب تک میں اپنے دوست کو غلط گھماتا رہا ہوں۔ نئی دوستی میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ "ٹیلونگ برش نے ایک میٹھی شکایت کے لہجے میں مجھ سے کہا "اپنی عزمن سے غیور ہو کر اکثر انسان اپنے دوست کی شخصیت نہیں دیکھتے اس کا طریق کار اور نادیدہ نگاہ بھول جاتے ہیں اور اسے غلط طریقے سے گھمانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ایک ذرا سی سمجھ سے معاملہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔"

میں نے اس کے نرم نرم بال دائیں سے بائیں گھماتے ہوئے ندامت مہرے لہجے میں کہا "تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

ٹیلونگ برش نے جواب دیا "دوستی ہی کیا جس میں زخم نہ ہوں؟"

شیونگ برش سے یہ میری پہلی بات چیت تھی بہت سے انسان صرف انسانوں سے بات کرتے ہیں۔ کچھ لوگ جانوروں کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں لیکن اس سے آگے کوئی نہیں بڑھتا حالانکہ اگر غور کیا جائے تو اس دنیا کی ہر چیز بولتی ہے۔ کرسی بات کرتی ہے کھٹیا گویا ہوتی ہے۔ دیوار سرگوشی کرتی ہے۔ گل دان کے پھول نغمہ سناتے ہیں اور راستے کے پتھر ہر آن کچھ کہتے جاتے ہیں۔ محبت، شفقت اور رفاقت سے ہر چیز بولتی ہے۔ سننے اور سمجھنے والا موجود ہو تو کائنات کی کوئی ایک شے کسی دوسری شے سے الگ نہیں رہتی اس لئے اب کی بار جو میں نے اسے پانی میں بھگو کر صابن لگایا اور اسے اپنے رخسار پر دائیں سے بائیں گھمایا تو مجھے اس کے بال پہلے سے کہیں زیادہ ملائم اور نرم معلوم ہوئے اور شیونگ بھی عمدہ بن گیا اور میں نے اپنے دوست کو بدلتے کا خیال ترک کر دیا۔

آہستہ آہستہ ہم دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوتے گئے اور مجھے اپنے دوست کے بارے میں نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں مثلاً یہ کہ میری طرح اسے بھی ٹھنڈے پانی کے غسل سے نفرت ہے، سرد پانی سے اس کا جسم ٹھہر جاتا ہے، بال سخت ہو جاتے ہیں جھاگ بھی زیادہ نہیں آتا، بہت گرم پانی سے بھی گھبراتا ہے اس کے سر کے بال ایسے جلیجے سے پو جاتے ہیں کہ ٹھیک سے شیونگ نہیں ہو سکتا، نیم گرم پانی اس کے لئے بہترین ہے۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اکثر میری گرفت سے پھسل جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میں اس کی کمر بڑے زور سے پکڑتا ہوں۔ دوست پر جس قدر آپ کی گرفت مضبوط اور سخت ہوگی اتنا ہی وہ رسیاں ٹڑا کر آپ سے دور بھاگنے کی کوشش کرے گا اس لئے گرفت ہلکی ہونی چاہیے۔ اور دباؤ مدیم، شیونگ برش کو پکڑنے کا بہترین



طریقہ یہ ہے کہ اسے عورت کی طرح پکڑا جائے اور عورت کو کپڑے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے برش کی طرح تھاما جائے تبھی بہترین نتائج مرتب ہوتے ہیں اس کے علاوہ اگلے چند ہینڈز میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میرے شیونگ برش کو ایک خاص قسم کی صابن کی ٹکیا پسند آگئی ہے۔ روزانی۔ اس دوران میں نے بہت سی صابن کی ٹکیاں بدلیں۔ آسٹرا، جاکو، تارا، شاہ پسند مگر کسی صابن سے وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو روزانی کی خاصیت ہے مرد کی طرح شیونگ برش بھی صحن پرست ہے وہ اپنی صابن کی ٹکیا پہچانتا ہے۔ میں نے شیونگ برش سے کہا، یوں دیکھا جائے تو ایک صابن کی ٹکیا اور ایک عورت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ سبھی عورتیں صابن کی ٹکیا ہوتی ہیں اسی طرح ملائم اور نرم ہوتی ہیں اسی طرح ہسکتی ہیں۔ صاف ستھری اور اجلی معلوم ہوتی ہیں پیار سے ٹھوڑی چھوتی ہیں رخسار چومتی ہیں اور گردن میں بانہیں ڈال کر ہر روز مرد کی جامت بناتی ہیں۔ برش بولا، مگر صابن کی ٹکیا گھلتی بھی تو ہے یہ شمع سا گھٹن کوئی صابن کی ٹکیا سے سکھے کسی دوسرے کی خاطر رفتہ رفتہ گھل کر اپنی جان دے دینا اسی غلوک کا خاصہ ہے۔ اتنی بڑی قربانی تو آج تک کسی شیونگ برش نے نہ دی ہوگی جس دن صابن کی ٹکیا ختم ہو جائے گی تم بازار سے دوسری خرید لاؤ گے ٹکیا مرد کی بے وفا فطرت کو جانتی ہے، پھر بھی ہر آن گھلتی ہے اور گھل گھل کر مرد کے رخسار چمکاتی ہے ایسا ایشیا عورت کے سوا اور کس سے ممکن ہے۔

میں چپ چور سا کیونکہ عمر عزیز کے پینتیس برس گزر جانے کے بعد بھی کنوارا تھا لیکن میں نے اتنا ضرور کیا کہ آئینے کے سامنے اپنے شیونگ برش اور اس کی ٹکیا کو اکٹھا کھڑا کر دیا۔ پھر ان دونوں کو یوں ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر مجھے ایسا عسوس ہوا کہ جیسے کالج کے کسی

بلند بلادرچوں والے مال کے باہر میاں بیوی مسکراتے ہوئے اپنے ہمانوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ دونوں ایسے متبسم اور خوش معلوم چور رہے تھے کہ جب سے میں ان دونوں کو ہمیشہ اکٹھا رکھتا ہوں آئینے کے سامنے البتہ جب کبھی شیونگ برش سے خفا ہوتا ہوں تو اس کی ٹھیکیا گواٹھا کر آئینے کے دوسرے کونے کی طرف الگ رکھ دیتا ہوں اس وقت میرے شیونگ برش کی صورت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ بڑا مزہ آتا ہے مجھے ان دونوں کو اکٹھا کرنے میں اور پھر جب جی چاہے تو الگ کر دینے میں، شاید خدا کو بھی کچھ اس طرح مزہ آتا ہوگا۔

دفتر میں ایک بدنام بڑی مٹی سونی بنا ہے کئی جگہ اس کا معاشقہ چلتا ہے وہ میرے پاس بھی کبھی کبھی آتی تھی۔ بس یوں ہی سی مٹی، دہلی تیلی ساولی، آنکھوں کے سوا اس کے چہرے میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی بادامی آنکھیں اور ابو دکان کی طرح تنے ہوئے شاید اسے بھی معلوم تھا کہ اس کے پاس آنکھوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس لئے وہ اپنی آنکھوں سے بہت سا کام لیتی تھی اس کی آنکھیں دیکھنے کے علاوہ بولتی بھی تھیں، کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے سن بھی رہی ہیں۔ کبھی کبھی ماتھ پھیلا کر اپنے پاس بلاتی تھیں کبھی کبھی آہیں بھر کر سسکتی چوٹی معلوم ہوتی تھیں۔ کبھی وہ بلی کی آنکھوں کی طرح چالاک دکھائی دیتیں، کبھی سقراط کی آنکھوں کی طرح فلسفے میں ڈوبی ہوئی کبھی بچوں کی طرح بھولی اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوتی کہ ایک مرد اپنی آنکھوں سے کتنا کام لے سکتا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ جن کے پاس جو ہوتا ہے وہ اسی سے کام لیتا ہے۔

میں اس سے محبت نہیں کرتا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ بس یوں ہی میرے پاس چلی آتی ہے دوسروں سے اکتا کر اور وہ دوسرے بھی غالباً میری طرح

زمانے سے، حالات سے، زندگی سے ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے ہوں گے اور اسی طرح سلسلے وار ایک سے دوسرے سے تیسرے تک یہ یکسانی اور اکتاہٹ کی زنجیر چلتی ہے جس میں کسی نرم، کسی دفتری یا کسی مل کی چھوٹی سی نوکری ہوتی ہے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا نیم تار ایک بدبو دار سیلا ہوا کمرہ ہوتا ہے جس میں ایک طرف بانس کی کچھپیوں کے بک ٹیلف پر بہت سی کتابیں اور فائلیں پڑی رہتی ہیں، دوسرے کونے میں کتابوں اور رسالوں کا بہت بڑا ڈھیر پڑا رہتا ہے دو تین کرسیاں ہوتی ہیں ایک ٹوٹا سا اسٹول ہوتا ہے اور ایک چھوٹی سی میز ہوتی ہے جو بیک وقت کھانے کی میز، مطالعے کی تلاش کی میز اور بچانوں کے سونے کا کام دیتی ہے جس پر کسی دہانے میں ایک خوبصورت میز پوش بچھا ہوا ہو گا جس کا گیر اسبز رنگ اب متواتر استعمال سے اور نہ دھلنے سے سیاہی مائل ہو چکا ہے جس کے گلابی کنارے پر بھی ہوئی اجنتا کی حیناؤں کے چہرے پر پانی کے دھبے، سگریٹ کی راکھ، شوربے کی چکنا بیٹ، نوشین پن کی سیاہی اور صابن کا جھاگ جما ہوا ہے اور ان سب کے بیچ بان کی ایک جھلنگا چار پائی ہوتی ہے جس پر بیٹھے بیٹھے آدمی زندگی کے سب کام کر سکتا ہے اس پر آلتی پالتی کرکھا کرکھا سکتا ہے، پائنٹی پر فائلیں رکھ کر کام کر سکتا ہے، میز قریب گھسیٹ کر شلو کر سکتا ہے، عورت کو قریب گھسیٹ کر بھت کر سکتا ہے، بچے پیدا کر سکتا ہے، جی سکتا ہے، سو سکتا ہے، مر سکتا ہے، آخر ہمارے ایسے لاکھوں کرشڈوں انسانوں کو ایک بان کی کھاٹ کے سوا اور چاہیے بھی کیا اور میرے ایسے سست الوجود اور کاپی کے مارے ہوئے آدمی کے نزدیک تو جنت کا تصور بان کی کھاٹ سے زیادہ نہیں ہے جس پر بیٹھے بیٹھے بھی زندگی کے سارے کام سرانجام دیئے جاسکتے ہیں اور میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ کس طرح کی جنت ہوگی جس کے لئے دنیا کے لوگ دن رات

اتنی بڑی نیکیاں کرتے پھرتے ہیں یہ نیکیاں جن کے پچھتے ہوئے غول کے اندر خود غرضی کے  
 سوا کچھ نہیں ہوتا کس طرح کی جنت میں دیں گی کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے کہ آدمی بان کی  
 ایک چوٹی سی کھٹیا پر لیٹ جائے اور چپکے چپکے نیلا آسمان دیکھ کر دیا کرے یا خوبصورت  
 عورتوں کو ہلے ہلے گلی سے گزرتے دیکھ کر مسکرایا کرے یا بلی کے بچوں کو ایک دوسرے سے  
 کھیلنے ہوئے دیکھ کر خوش ہوا کرے کبھی کبھی نیکی کرنے سے مجھے یہ کام بہت بہتر معلوم  
 ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جس دن موتی آجاتی تھی اور میں کوئی بیہودہ سی فلم دیکھنے  
 کے لئے باہر نہیں جانا ہوتا تھا تو میرے کمرے کا نقشہ بدل جاتا تھا پہلے تو وہ اپنی ساڑھی  
 کا پلو اپنی کمر کے گرد پیٹ کر کمرے میں جھاڑ دیتی تھی پھر میرا ایک شیلف ٹھیک کرتی  
 تھی کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر کی چھان ٹھیک کرنے کے بعد رسالے الگ کر دیتی  
 تھی اور کتابیں تظار دار الگ فرش پر سجا دیتی تھی میز پر میرا سامان ترینے سے رکھتی تھی  
 اسٹول پر رکھے ہوئے کلاک کو چابی دیتی تھی اور پھر ہاتھ منہ دھو کر میرے قریب آکر بان  
 کی گھاٹ پر بیٹھ جاتی تھی اور میں ان تمام کاموں کے بدلے میں اس کے ہاتھ ڈال  
 کے اسے ایک بوسہ دیتا تھا جیسے جھاڑو بھارو کا کام ٹھیک سے کرتے ہیں ہم بھائی کو کہہ دیتے ہیں۔

اسی طرح وہ کبھی کبھار آتی رہی اور زندگی کو برداشت کرنے کا یہ سلسلہ نیم بیزاری اور  
 نیم اکتاہٹ کے عالم میں چلتا رہا لیکن ایک دن جو وہ آئی تو میں نے اسے عجیب رنگ میں  
 پایا۔ وہ بے حد کھوئی کھوئی اور گم مضم اور کبھی کبھی وحشت زدہ سی دکھائی دیتی اور گھبرا گھبرا  
 کے میری طرف دیکھتی۔ جب میں نے پوچھا کیا بات ہے تو کچھ نہیں کہہ کر بار بار گاتی رہی



پھر پریشان ہو کر اپنی ساڑھی کا پتو اپنی انگلی پر پیٹتی رہی اور کھولتی رہی۔ بار کر میں اُس کے ذہنی  
خلفشار کی طرف سے اُن جان بن گیا اور ہاتھ روم سے شیو کا سامان اٹھا لیا اور وہیں مینر  
آگے گھسیٹ کے اُس کے سامنے شیو کی تیاری کرتے۔ آخر وہ بولی: "تم مجھ سے نشادی کیوں  
نہیں کر لیتے؟"

"کیوں کر لوں؟"

وہ بہت دیر تک چپ رہی آخر اس کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی۔ بالکل گھبرا کر  
بار بار سر ہلا کر بولی: "میں... میں اس زندگی سے عاجز آ گئی ہوں؟"  
"تو اپنی مصیبت مجھ پر کیوں لانا چاہتی ہو؟"

"تم سے نہ کہوں تو پھر کس سے کہوں؟" جواب میں میرے ذہن میں بہت سے نام آئے  
مگر میں چپ رہا۔ اُس نے بڑی سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی: "کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو؟"  
"نہیں۔"

غالباً اس جواب کی اُسے توقع نہیں تھی کیونکہ یہ سننے ہی اُس نے فوراً میرا ہاتھ چھوڑ دیا  
ایک لمحے کے لئے میری طرف پٹی پٹی نگاہوں سے دیکھا پھر ٹھس ہو کر بیٹھ گئی اور میں چپ چاپ  
شیو بنانا رہا اور جب شیو بنا چکا تو اُس نے صابن کے جھاگ سے مجھ پر واشیونگ بڑش اٹھا  
لیا اور اُسے دھیرے دھیرے اپنے رخساروں پر پھیرنے لگی کیا کر رہی ہو؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا:  
"مرو بننا چاہتی ہو؟" اُس نے سسکتے سسکتے کہا۔

جب وہ چلی گئی تو واشیونگ بڑش نے مجھ سے کہا: "تم کتنے کڑوے اور کھردرے ہو۔"  
کیا تم میری طرح کسی دوسرے کی مصیبت پر جھاگ نہیں لگا سکتے جھاگ لگانے سے زندگی کے  
بہت سے کائناتے نرم پڑ جاتے ہیں کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟

”سب سمجھتا ہوں“ میں نے کہا۔ لیکن کیا کروں؟ میرے ذہن میں جس بیوی کی تصویر  
 بسی ہے اس پر سونی پوری نہیں اترتی اور جو پوری اترتی ہے، اُسے مائل کرنے کے لئے  
 میری تنخواہ پان سو ہوتی چاہیئے۔ تم سمجھتے ہو، میں شادی نہیں کرانا چاہتا مگر کس سے کروں  
 شادی اور کہاں ہے وہ گھر جس کے آگن سے مجھے آسمان نظر آتا ہو اور کہاں رکھوں گا  
 میں اپنے بچوں کو؟ اس نیم تاریک بدبودار مرغیوں کے ڈربے میں؟ تو پھر ہم اپنے آپ  
 کو انسان کہتے ہیں۔ صاف صاف مرغیاں اور بھڑی اور بکرے کیوں نہیں کہتے۔ اس لفظی  
 رعایت کا کیا فائدہ؟ جب کہ میری تنخواہ ایک سو ساٹھ روپے ہے اور سال میں تین روپے  
 کی ترقی مجھے ملتی ہے اور تین سال بعد جب میرے ہاں تین بچے ہو جائیں گے تو جناب!  
 میں تو اُن تین بچوں کو نو روپے ماہانہ پر نہیں پال سکتا۔ اگر میں اپنے خوابوں کی دیوی سے  
 نہیں، سونی سے بھی شادی کروں تو بھی نہیں پال سکتا۔“

دوسرے دن دفتر میں سونی مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ معلوم ہوا کہ اس نے استعفا  
 دے دیا ہے اور کہیں چلی گئی ہے۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ اس طرز عمل کی مجھے اُس سے اُمید  
 نہ تھی۔ میں تھوڑا سا خوش بھی ہوا کہ چلو کسی نے میری خاطر اپنے آپ کو پریشانی میں تو ڈالا  
 اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی کچھ ہوں۔ پھر میرے خیال نے دوسری راہ اختیار کی  
 اور نہ؟ کہیں جھنجلا کر چلی گئی ہو گی۔ کسی نہ کسی نے وہ ضرور شادی کرے گی۔ کوئی نہ کوئی  
 اسحق اُسے ضرور مل جائے گا۔

دن پھر اُسی یکسانی سے گزرتے گئے۔ اُسکا اکا ہٹ اور بیزاری سے جو میری طبیعت کا  
 خاصہ بن چکی تھی۔ اس دوران جون آئی جس کے بال بھورے تھے اور ایل آئی جس کی آنکھیں  
 بھوری تھیں اور دہلا آئی جس کی ناک چٹی تھی اور۔۔۔ نام گناتے سے کیا فائدہ؟ اُن سب

کی صورتیں گو مختلف تھیں لیکن وہ سب ایک ہی تھیں۔ وہ سب بہت صوفیوں میں سے کسی ایک کو تلاش کر رہی تھیں اور ہم بھی بہتوں میں سے کسی ایک کو ڈھونڈ رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم سب لوگ کسی بہت بڑے کھنڈر میں آنکے ہیں اور ایک دوسرے کے چہروں کی بھول بھلیوں میں اپنا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایک راستہ دوسرے راستے کو کاٹتا ہے، ایک چہرہ دوسرے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک نگاہ گہری پہچان کی ٹپ ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ چہرہ مکمل اجنبی ہو جاتا ہے اور راہی مایوس ہو کر پھر اپنی تلاش پر آگے دوڑنے لگتا ہے اور سارا کھیل یوں لگتا ہے جیسے کسی اندھیری غلام گردش میں بہت سے چوہے مختلف سمتوں میں ایک دوسرے پر پھلانگتے ہوئے جا رہے ہوں۔

اپنی بے معنی، بے مقصد زندگی سے عاجز آکر میں نے ایک دن فرم کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور رسول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہو گیا کیونکہ جب کبھی کوئی نیا دالسرے ہندوستان میں آتا تھا، میرا جی اس کا گلا گھونٹ دینے کو چاہتا تھا۔ مجھ سے پہلے میرے باپ کا بھی یہی جی چاہتا تھا اور اس سے پہلے میرے باپ کے باپ کا اور اس طرح نسلاں اور پشتوں سے جمع ہوتی ہوئی یہ نفرت مجھ تک پہنچی تھی اور جب اس نفرت کی حدت سے میرا خون کھولنے لگا اور جب فرم کے انگریز منیجر کو دیکھ کر مجھے ہمارا سا چڑھنے لگا تو میں نے فرم کی ملازمت چھوڑ دی اور رسول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لینے لگا کیونکہ نفرت ایک مرض ہے اور جب تک آدمی اسے اپنے جسم اور روح کی اسٹیم سے خارج نہ کر دے، اسے چین نہیں آسکتا اس لئے جب مجھے دو سال کی قید ہوئی تو قرار سا آگیا، دل کو ایک تسکین سی ہوئی جیسے مرض سے نجات مل گئی ہو۔ جیل کی زندگی نے مجھے کسی طرح کی حیرت نہیں ہوئی جو آدمی زندگی بھر ایک تنگ و تاریک کھولی میں رہنے کا عادی ہو، اسے جیل کی پیرکیں کیوں بڑی معلوم ہوں

گی۔ جس آدمی نے اپنی ساری زندگی بھونپڑے جیسے ڈھابوں کا غلیظ کھانا کھا کر بسر کی ہو اُسے جیل کا کھانا کیوں برا معلوم ہوگا۔ جو آدمی ایک چھوٹی سی میز پر چار فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی میز پر ایک کونے میں صبح و شام تک سر جھکائے دس گھنٹے کام کرتے کا عادی ہو، اُسے جیل کی مشقت سے کیا تکلیف ہوگی؟ یہ جیل بہت بڑی تھی اور اس میں سینکڑوں قیدی تھے اور لمبی لمبی دیواروں کے اندر گھاس کے میدان تھے اور درختوں کی قطاریں تھیں اور پھولوں کے قطعے تھے اور رات کو بیرکوں کے باہر چاندنی چمکتی تھی اور ہارسنگھار کے پھولوں کی خوشبو آتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آسمان نظر آتا تھا اور دو وقت پر ایک کو کھانا ملتا تھا جو جیل سے باہر کسی کو کہاں ملتا ہے اور رہنے کو ایک فرش اور ایک چھت ملتی تھی۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ سردیوں میں جب فٹ پاتھ بہت ٹھنڈے ہوتے ہیں اور برساتوں میں جب وہ بہت گیلے ہوتے ہیں، بہت سے غریب لوگ بے گھر لوگ چھوٹے موٹے جرائم کر کے جیل آ جاتے ہیں اور مزے سے تین چار ماہ گزار کر چلے جاتے ہیں۔ وہ لوگ دراصل مجرم نہیں کرتے بلکہ حالات سے ایک طرح کی سول نافرمانی کرتے ہیں اور یہ سول نافرمانی ہزاروں سال سے جاری ہے اور بڑی بڑی جیلوں کے باوجود اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک باہر کی دنیا میں عام آدمیوں کو وہ سہولتیں بہم نہ پہنچائی جائیں گی جو بڑی سے بڑی جیل میں بھی ایک عام قیدی کو حاصل ہوتی ہیں۔

جیل میں مجھے تیسرے درجے میں رکھا گیا تھا جہاں میری طرح کے سینکڑوں لوگ مجھ سے پہلے سے موجود تھے اور جن کی زندگیاں مسلسل ایک تیسرے درجے کا سفر کر رہی تھیں۔ یہاں ہم سب لوگوں کو ایک سے کپڑے دیئے گئے تھے اور مزے کی بات یہ تھی



کہ ہمارا کوئی نام نہیں تھا۔ ہم صوبہ کے نمبر تھے اور میرا نمبر ۵۴ تھا اور میری بیرک کے تالے کا نمبر ۱۱ تھا اور میرے شیونگ بڑش کا نمبر ۳۲۱ تھا اور یہاں اگر پہلی بار میں نے ایک انسان کے مقابلے میں اپنے آپ کو ایک آدمی تالے اور لکڑی کے ایک شیونگ بڑش کے بہت قریب محسوس کیا اور شاید اسی لئے بہت محفوظ بھی ہوا اور مجھے اندازہ ہوا کہ میری طرح کے سُست اور کاہل انسانوں کے لئے جیل بہترین جگہ ہے، جو لاکھوں آدمیوں کو جنگ کی بھٹی میں نہیں بھونک سکتے جو بان کی ایک کھٹیا پر لیٹ کر صرف خواب دیکھ سکتے ہیں۔

میں جیل میں اپنا شیونگ بڑش لے گیا تھا اور جیل کے ساتھیوں میں میرا شیونگ بڑش بہت مقبول ہو گیا تھا کیونکہ وہ واقعی ایک عمدہ شیونگ بڑش تھا اور بڑی محنت سے اپنا کام کرتا تھا حالانکہ جیل میں عمدہ مابن اور عمدہ بلیڈ دستیاب نہیں ہو سکتے تھے پھر بھی شیونگ بڑش بڑی تیز رہی سے اپنا کام کئے جاتا تھا اور ہر روز تقریباً دس بارہ آدمیوں کے شیونگ کرتا تھا۔ ان آدمیوں میں اٹاؤ کا بھگیو اہیر بھی تھا۔ بھگیو اہیر ساڑھے چھ فٹ کا اونچا لانا ہوا تھا جو انگریزوں کی فوجی ٹرین کے آنے سے قبل ریل کی پٹری اکھاڑنے ہوئے پایا گیا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے صرف سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ اُس کی چھاتی بڑی جوڑی تھی اور وارڈھی بڑی سخت اور گردن بیل کی طرح مضبوط تھی۔ وہ اکثر اپنے وارڈروں سے جھگڑا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بالکل پاگل ہو گیا، اُس نے اپنے وارڈر کا جیڑا تول دیا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، میرا آئینہ توڑ دیا اور میرے شیونگ بڑش کو بار بار اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا کہ اس کے خول کا کریمیم نما چھلا ٹوٹ گیا اور میرے شیونگ بڑش کے سارے خوبصورت بل زمین پر گر گئے۔ بڑی مشکل سے ہمارے بہت سے ساتھیوں نے اُسے نکالا اور اُسے پکڑ کر وارڈروں کے حوالے کر دیا۔ اگر شیونگ بڑش اس قدر خوبصورت اور کارآمد نہ

ہوتا تو کسی کو اس سے بہتر نہ ہوتی مگر میرا شیونگ بُرش خوبصورت اور کارآمد ہونے کے علاوہ بے قصور بھی تو تھا اس لئے کسی نے اس کا ٹوٹا ہوا چھلا اٹھایا، کسی نے اس کا لکڑی کا خول۔ دو تین آدمیوں نے مل کر اس کے نرم اور لٹم بال چُن کر جمع کئے ایک وارڈرنے بالکل اسی سائز کا پتیل کا چھلا مجھے دینے کا وعدہ کیا اور دو تین دن کی سرجری اور مرہم پٹی کے بعد میرا شیونگ بُرش پھر اپنے محاذ پر موجود تھا۔ اس کے جسم پر بہت سے زخموں کے نشان تھے اور اس کے سر کے کچھ بال بھی غائب تھے اور نصف سے زیادہ اس کا پالش بھی نکل گیا تھا اور اس کی چوٹی ہتھی پر کریم کے پچائے پتیل کا ایک بدنما چھلا تھا مگر وہ پھر سے کام کر رہا تھا اور اپنی زندگی، افادیت اور شخصیت کا ثبوت دے رہا تھا۔ گروہ اب جوان نہ رہا تھا خوبصورت نہ تھا بلکہ کسی قدر عمر رسیدہ معلوم ہوتا تھا اور بہت مدت بعد مجھے اس کے لہجے میں شکایت سی محسوس ہوئی۔ تم اپنے دوستوں کو برتنا نہیں جانتے۔ وہ بولا۔ اس کم بخت بھگیلو کے بال بڑے سخت ہیں۔ اُسے میرے جیسا بُرش نہیں چاہیے؟ سور کے بالوں والا بُرش چاہیے۔ تم نے مجھے اس کے حوالے کیوں کیا؟ میں اسے سخت بالوں اور کڑے رخساروں پر کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ دوستی وہیں مضبوط ہوتی ہے جہاں شدید اختلاف کے باوجود کچھ قدریں مشترک ہوں۔ تم نے میرے اور بھگیلو کے درمیان کون سی قدر مشترک دیکھی؟ دوست کو غلط باتھوں میں نہیں دیتا چاہیے۔ یہ دوستی کی توہین ہے۔

”اتنے رئیس مت بنو۔ مت بھولو کہ تم ایک غریب آدمی کے بُرش ہو اور بھگیلو بھی ایک غریب آدمی ہے اور یہی غریبی تم دونوں میں مشترک ہے۔“

”لیکن میرا قصور کیا تھا؟ بُرش نے پوچھا۔“

”تم بے گناہ تھے۔ اس سے بڑا قصور اس دنیا میں اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے بُرش کو

سمجھاتے، سوئے کہا۔ بھگیلو بھی تمہاری طرح بے قصور ہے۔ اُسے عقیدہ آگیا تھا کیونکہ جب سے وہ جیل آیا ہے، اس کی بیوی بھاگ گئی ہے، اس کے چچا نے اس کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کی ماں کنویں میں گر کر مر گئی ہے۔ ان حالات میں کوئی بھی شخص پاگل ہو سکتا ہے۔  
 ”تم میرے مالک تھے۔ برٹش نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ تم میری جان بھی لے لیتے تو مجھے غم نہ ہوتا۔“

”میرے دوست! میں تمہیں امریکی شاعر وین کے دو مصرعے ترجمہ کر کے سنانا ہوں۔ سنو وہ چیز جو سب کی ہے اس کا کوئی ایک مالک کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ جسے سب استعمال کرتے ہیں، اُسے کون مار سکتا ہے؟ اگر تم نے دو دن پہلے کا وہ منظر دیکھا ہوتا جب دو دہن ہاتھوں نے تمہاری زندگی ریڑھ ریڑھ کر کے جیل کے فرش سے اٹھالی اور اُسے از سر نو ترتیب دیا۔ تم بھگیلو کو یقیناً معاف کر دیتے کیونکہ کسی ایک شخص کی زندگی صرف اس کی اپنی زندگی ہے، ایک شخص کی زندگی میں سینکڑوں لوگ، ہزاروں حالات اور لاکھوں کروڑوں غلبے حقدار لیتے ہیں۔ پھر تم صرف اپنے کیسے ہو سکتے ہو یا صرف میرے کیسے؟“

جیل سے رہا ہونے میں اپنے شہر واپس آگیا اور دفترِ ملازمت ڈھونڈنے لگا۔ ملک آزاد ہو چکا تھا اور اس کی آزادی کی جدوجہد کا ایک چھوٹا سا غلبہ میں بھی تھا اور بھگیلو ابھی اور ہماری طرح کے دوسرے بہت سے لوگ جن کے نام تاریخ کے کسی صفحے پر اور سڑک کے کسی کعبے پر نہ ہوں گے کیونکہ لوگ ہمیشہ پھولوں کو دیکھتے ہیں، کھاد کی طرح گندے میلے کچیلے غلیظ غریب آدمیوں پر ان کی نظر کہاں جاتی ہے۔

تین ماہ کی کاوش کے بعد مجھے ایک دفتر میں ایک سو چالیس روپے کی نوکری مل گئی۔ نوکری ملنے کے چند روز بعد مجھے اپنے دوست کا مکان چھوڑ دینا پڑا کیونکہ اس کی بیوی بیکے

سے آنے والی تھی اس لئے میں اپنا سوٹ کیس لے کر نکل کھڑا ہوا کسی کی تلاش میں اور سب سے پہلے میرے ذہن میں اپنے پہلے گھر کا خیال آیا۔ ممکن ہے وہ خالی ہو مگر اتنے عرصے تک اتنے بڑے شہر میں کوئی گھر خالی کیسے رہ سکتا ہے؟ اس کے باوجود میرے قدم مجھے اسی پرانے گھر کی طرف لے گئے۔ ممکن ہے اسی بلڈنگ میں کوئی دوسری کھولی خالی ہو۔ مالک مکان سے میرے مراسم اچھے تھے، وہ کوئی انتظام کر دے گا لیکن اس بلڈنگ کے اندر پہنچ کر میں مالک مکان کے دفتر میں نہیں گیا۔ جو گراؤنڈ فلور پر واقع تھا بلکہ دو منزل سیڑھیاں چڑھ کر اپنا پرانا گھر دیکھنے گیا۔ دروازے پر تالا نہیں تھا مگر وہ اندر سے بند تھا اور کہیں اندر سے بدن کھٹکنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے بے اختیار دروازہ کھٹ کھٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے چاب ستائی دی اور کسی نے دروازہ کھولا میں نے دیکھا کہ دروازے پر سونی کھڑی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ ہنس کر دی آگے بڑھ کر اس نے میرا سوٹ کیس میرے ہاتھ سے چھین لیا اور مجھے پہنچ کر اندر لے گئی اور دروازہ بند کرتے ہی میرے سینے میں سمنہ چھپا کر بولی "دو سال سے میں نے یہ گھر تمہارے لئے تیار کر رکھا ہے۔ میرا خیال تھا، کبھی نہ کبھی تم ضرور آؤ گے۔ آؤ۔ دیکھو، اپنا گھر میری آنکھوں میں سنسو آگئے اور میں نے زور سے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور چند لمحوں کے مکمل سنلے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے لگے لگے کہتے رہے پھر اس نے آہستہ سے اپنا سر میرے سینے سے ذرا سا ہٹا کر مجھے دو تین بار زور سے سونگھا اور ہنس کر بولی "مائے تمہارے سینے سے کیسی کورے گھڑے کی کچی کچی خوشبو آتی ہے۔"

ہر ڈال میں پھول آتے ہیں اور ہر غلاستاروں سے بھر جاتی ہے۔ میری زندگی بھی چھوٹی چھوٹی خوبصورتیوں سے بھر نے لگی اور اس نیم تاریک کھولی میں بھی گھر کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں نختے نختے دیوں کی طرح جگمگانے لگیں۔ دو سال بعد میرے گھر میں ایک بچی پیدا ہوئی



وہ میری گود میں بیٹھ جاتی تھی اور غول غاں کرتے ہوئے ایک عجیب زبان میں میرا اخبار پڑھتی تھی۔ کبھی کبھی اپنا پورا ہاتھ میرے منہ میں ڈال کر میری زبان پکڑنے کی کوشش کرتی تھی اور میری ٹائی پکڑ کر اس سے جھولنے کی کوشش کرتے ہوئے بے اختیار کھل کھلا کر منہس پڑتی تھی۔ اُسے میرا شیونگ بُرش بھی بہت پسند تھا۔ وہ اکثر میری نقل کرتے ہوئے شیو کرنے کی کوشش کرتی اور کئی بار اُس نے صابن کے جھاگ سے اپنا چہرہ بھر لیا اور نالی بجا کر کہنے لگی "آہا، میں پتیا ہوں۔ تمی دیکھو، میں پتیا ہوں۔"

میں اپنی بچی کے لئے ایک خوبصورت پنگوڑا لایا اور سونی نے اُس کے لئے بڑے خوبصورت فراک لئے اور میں نے شدید جدوجہد کے بعد سو دو سو روپے کی ایک بہتر ملازمت بھی حاصل کر لی کیونکہ اس بچی کے لئے میرے سوسے اور عزائم بلند ہو چلے تھے۔ میں اپنی بچی کو بہترین کھانا دوں گا۔ بہترین کپڑے اور بہترین تعلیم اور نشادی کے بعد کسی کھولی میں نہیں بلکہ پانچ کمروں والے جگمگاتے ہوئے کسی عمدہ ٹیلیٹ میں جائے گا۔ اسی طرح ماں باپ خواب دیکھتے ہیں۔ ایک دن جب میں شیو کی تیاری کر رہا تھا اور شیونگ بُرش کو صابن کی ٹیکا سے رگڑ کر جھاگ پیدا کر رہا تھا، میری بوی ایک کونے سے چلائی "دیکھو تو آشاکو کیا ہو گیا ہے؟ اس کے چہرے پر وحشت اور خوف کا شدید اثر تھا۔ میں نے صابن سے لقمہ اڑا ہوا شیونگ بُرش دیں پھوٹا، تویلے سے منہ صاف کیا اور آشاک طرف بڑھا اور اس کا منہ کھول کر غور سے اندر دیکھنے لگا: بچہ کا منہ اندر سے سو جتا جا رہا تھا اور اُسے سانس لینے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ میں فوراً اسے گود میں اٹھائے اٹھائے بیڑھیوں کے نیچے بھاگا اور ایک ٹیکس میں بیٹھ کر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے دوا اور انجیکشن دیتے ہوئے بتایا کہ بچی کو ڈیپتھیریا ہو گیا ہے۔ جو بیس گھنٹے کے اندر اندر بچی چل بسی۔



تین دن تک میں دفتر نہیں گیا، کپڑے نہیں بدلے، شیو نہیں کیا۔ اپنی کھاٹ پر لیٹے چھت کی طرف دیکھتا رہتا۔ ایک کونے میں پنگوڑا پڑا تھا اور اس پر بچی کے فراک پڑے تھے جو ابھی ابھی دھوبی سے دھل کر آئے تھے۔ جس طرح میری بچی کے فراک دھوبی سے دھل کر آئے ہیں کیا اسی طرح میری بچی مرگھٹ سے واپس نہیں آ سکتی؟ سوئی تے روتے روتے مجھ سے پوچھا۔ میں نے بیزار ہو کر منہ پھیر لیا۔ میں کیا جواب دوں۔ میں کوئی خدا ہوں؟

چوتھے روز سوئی نے مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بستر سے اٹھایا۔ ”کیا اسی کھاٹ پر لیٹے مر جانے کا ارادہ ہے۔ دفتر نہیں جاؤ گے۔ اٹھو، شیو کرو، کپڑے بدلو اور کام پر جاؤ۔“

میں شیو کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ شیونگ برش اس وقت سے صابن میں لتھڑا ہوا پڑا تھا جس وقت میں پلٹ کر بچی کا منہ دیکھنے کے لئے مڑا تھا۔ صابن کا جھاگ اس کے بالوں میں سوکھ گیا تھا اور وہ اُن سفید سفید بالوں میں بہت بڑھا اور سوکھا ہوا اور غم زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے نل کھول کر باتھ روم میں اس کے بالوں سے سوکھا ہوا صابن چھڑایا اور اسے اچھی طرح صاف کر کے جب شیو کرنے لگا تو مجھے اس کا لمس بے حد ملائم کھن کی طرح نرم اور بالائی کی طرح ریشمیں معلوم ہوا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو مجھے ایسا لگا گیا یہ برش کے بال نہیں ہیں، میری بچی کی ننھی ننھی انگلیاں ہیں جو بڑے پیارا در محبت سے میرے رخساروں سے کھلتی ہوئی صابن کے جھاگ کی دھاریاں بکھیر رہی ہیں۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی اور آنسو میرے رخساروں پر بہہ بہہ کہ صابن کے جھاگ میں نلنے لگے اور مجھے ایسا لگا جیسے میرا شیو جگ برش بھی میرے ساتھ رو رہا ہے اور انتہائی رفاقت سے ہونے ہوئے میرے رخسار تھپک رہا ہے۔

ڈیڑھ سال بعد ہمارے ماں ایک اور بچی پیدا ہوئی لیکن مری ہوئی پھر تیسرے برس ایک

ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن وہ بھی مرا ہوا اس واقعے کے چند ماہ بعد سوئی اچانک مجھے چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ اُس نے مجھے نہ کچھ بتایا، نہ کہا، نہ میرے لئے کوئی خط چھوڑا چپ چاپ کہیں غائب ہو گئی۔ بہت جگہوں پر میں نے اُسے ڈھونڈا اور بہت عرصے تک میں نے اُس کی تلاش کی لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملی۔ میں پھر اپنی کھولی میں اکیلا رہ گیا۔

اب مجھے جو کچھ کہنا ہوتا ہے، اپنے شیونگ بُرش سے کہتا ہوں کیونکہ آدمی صرف نفرت کرنے والا صرف لڑنے جھگڑنے والا صرف کام کرنے والا انسان نہیں، وہ محبت کرنے والا انسان بھی ہے اور جب انسان اس کی بات نہ سُنیں تو وہ کسی سے تو اپنے دل کا درد کہے گا۔ چاہے وہ لکڑی کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ آٹھ سال سے میں اور میرا شیونگ بُرش اس کھولی میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ میرا شیونگ بُرش بہت بڑھا ہوا چلا ہے میری طرح اس کے سر کے بہت سے بال جھڑ گئے ہیں۔ میں لکڑی کے دستے کا سارا پلستر اکھڑا چکا ہے اور لکڑی میں بھی گہری گہری دراڑیں پڑتی جا رہی ہیں اور اس کا بننا پتیل کا خول جگہ جگہ سے یوں ہلتا ہے جیسے بڑھے کے مُتہ میں دانت ہلتے ہیں لیکن عمر کے ساتھ ساتھ وہ بھی بہت سیانا اور دانا ہو گیا ہے میں گھنٹوں اس سے باتیں کرتا ہوں اور اس کی باتیں سنا کرتا ہوں جو اس کے لکڑی کے دستے نے کبھی جنگل کے درختوں سے سُنی تھیں، جو اس کے بالوں نے غیر پالتو جانوروں سے مستعار لی تھیں۔ قدرت کا قانون، جانور کا سلیقہ اور انسان کی ہوش مندی اور زندگی کا گہرا درد ناک تجربہ بھی اس میں شامل ہیں۔

آٹھ برس بعد آج مجھے سوئی کا خط ملا ہے۔ سوئی مجھے واپس بلا رہی ہے۔ سوئی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس شادی سے اس کے دو بچے پیدا ہوئے، دونوں لڑکے دونوں زندہ ہیں۔ ایک کی عمر سات سال ہے، دوسرے کی پانچ سال۔ سوئی کا دوسرا شوہر مر چکا

ہے اور اب سوئی اپنے دونوں بچوں کو لے کر بھی اکیلے ہے۔ شاید وہ تو اب اپنی باقی زندگی کسی شوہر کے بغیر بسر کر سکتی ہے لیکن اس کے بچوں کو ایک باپ کی شاید ضرورت ہے۔ تمہیں جانا چاہیے۔ مشیزنگ برش نے دوسرے دن مجھے صلاح دی۔

”ہیں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ سوئی نے مجھے دھوکا دیا ہے وفاق کی؟“

”وہ تم سے بے وفا نہیں تھی، اپنی کوکھ کی وفاق دار تھی۔ ہر عورت اپنی کوکھ کی عزت کی محافظ ہوتی ہے۔ برش نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا: جب دوسرے ہوئے بچے پیدا ہوئے تو سوئی کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کی کوکھ کو کالک لگائی ہے اور کوئی باعزت عورت یہ کالک چھٹائے بغیر نہیں رہ سکتی یہ تو زندگی کا قانون ہے کہ ہر جان دار اپنی زندگی اور تخلیق کا ثبوت پیش کرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ جس کا روان رواں سرا میں تخلیق ہو، اپنے حق سے اذیہ رکھی جاسکتی ہے اس لئے وہ چلی گئی کیونکہ اُسے اپنی زندگی کا ثبوت پیش کرنا تھا اس میں نہ تمہارا قصور تھا، نہ اس کا۔ اس دنیا میں کتنے ہی دروایسے ہوتے ہیں جن کا الزام کسی کو نہیں دیا جاسکتا۔“

”اس دنیا میں کوئی کسی کا اپنا نہیں ہوتا، اپنا بنایا جاتا ہے“ برش نے جواب دیا۔

اپنایت ایک رشتہ ہی نہیں، ایک عمل بھی ہے۔“

”بھاڑ میں جائے تمہارا فلسفہ۔ میں نے غصے سے جھلاتے ہوئے کہا: میں اس گتیا کے پاس نہیں جاؤں گا۔ ہرگز ہرگز اس کے بیٹوں کا باپ نہیں بنوں گا۔“

”شرم نہیں آتی تمہیں اسی باتیں کہتے ہوئے: مجھے اُس بڑھے برش کے سر کا ایک ایک بال غصے سے تنہا معلوم ہوا۔ اگر ایک جھکی بھڑیے کی ماں انسان کے بچے کو اپنا بیٹا بنا سکتی ہے تو ہم انسان ہو کر کسی دوسرے انسان کے بچوں کو اپنا بیٹا نہیں بنا سکتے؟ پس اتنی ہی ہے تمہاری

تہذیب ۹

یہ ایک میں شرمندہ سا ہو گیا کیونکہ اس کا منطقی کے اندر مجھے ایک گہری اور وسیع حقیقت کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ میرا تیز و تند لہجہ خود بخود دھیمّا پڑ گیا اور آئینے میں دیکھ کر اور احساسِ ندامت سے مجبور ہو کر میں نے آہستہ سے کہا: اچھا اچھا میں کل اسے خط لکھوں گا۔

کل پرمت ٹاؤر کل تک شاید تمہارے غلوں کی گرمی ٹھنڈی ہو جائے ابھی لکھو اسی وقت! اچھا لکھنا ہوں۔ میں نے آئینے میں اپنی محبوب صودت دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ کہہ کر میں خط لکھنے کے لئے پٹا ہی تھا کہ میل پاؤں فرش پر پھیل گیا۔ اور شیونگ برش میرے ماتھے سے چھوٹ کر فریب کی دیوار سے بڑے زور سے ٹکرایا اور پھر فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ میں خود بھی بچتے بچتے دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور پھر سنبھل کر گھٹنوں کے بل اٹھتے ہوئے کپڑے جھاڑتے ہوئے جو سیدھا ہوا تو میں نے دیکھا فرش پر میرے شیونگ برش کی لاش پڑی ہے۔ سر کہیں، دھڑ کہیں، پاؤں کہیں اور اس کا چہرہ ایک ایسے بڑے آدمی کے کھلے ہوئے منہ کی طرح جھیاٹک تھا جس کے اندر ایک دانت باقی نہ رہا ہو۔ نکری کی ہنسی کے چھوٹے چھوٹے درخیزوں کڑے ہو چکے تھے۔ پنیل کا تھول ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اور شیونگ کے چند بال جو اس کے سر پر باقی رہ گئے تھے، عجیب منتشر شدہ حالات میں فرش پر ادھر ادھر خاک میں بکھرے پڑے تھے۔ یہ ایک کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور فرش کے گرد و غبار میں اس کے بال اڑ اڑ کر فضا میں بکھرنے لگے۔

تو یہ موت ہے، موت جس کا کوئی آپریشن نہیں ہوتا، جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا جو بالآخر کسی طرح نہیں مالی جاسکتی۔ میرے سینے سے دبی دبی ایک آہ سی نکلی۔ اس دوست نے اٹھاڑہ برس تک میرا ساتھ دیا۔ اس نے میری ہر کمینگی پر مانت کی اور میرا ہر دکھ جھیل

یہ میرے ساتھ چل گیا اور اندھی کھولی میں رہا اور جب سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو یہ میرے ساتھ رہا اس نے ہر مصیبت کا وار ہنس ہنس کر خالی دیا اور جب کسی نے مجھے زخم دیئے، اس نے ایک درد مند مسکراہٹ سے اس پر صابن کا نرم نرم جھاگ رکھ دیا۔  
 غم موت کا نہیں ہے، غم اس جانی پہچانی شکل و صورت کا ہے جو اب کبھی دکھائی نہ دے گی غم شخصیت کی اس ادا کا، حسن کی اس ترتیب کا ہے جو آج ہمیشہ کے لئے مٹ گئی  
 غم موت کا نہیں ہے غم اس مخصوص اور مانوس رشتے کا ہے جو آج ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا۔  
 ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھتا ہوا ننگے پاؤں سے فرش پر چلتا ہوا میں اس کے قریب پہنچا اور فرش پر بیٹھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے ٹکڑے یوں چھنے لگا جیسے کوئی جلی ہوئی چٹنا سے اپنے کسی پیارے کے پھول چٹنا ہے۔

چند دن تک میں شیو نہیں کیا، یوں ہی وارھی بڑھائے ادھر ادھر ایک عجیب بے گلی سے گھومتا رہا۔ چند لوگوں کو اب محسوس ہوا جیسے میرا کوئی قریبی رشتہ دار مر گیا ہو لیکن جب انہوں نے میرے غم کی وجہ پوچھتی چاہی تو میں انہیں کچھ نہ بتا سکا۔ کس سے کہنا کہ میرا شیونگ برش مر گیا ہے۔ اس دنیا میں جہاں آج کوئی ایک انسان کا رشتہ ملنے کو تیار نہیں ہے، ایک انسان کا ایک شیونگ برش سے رشتہ کون تسلیم کرے گا؟ مجھے معلوم ہے کہ غریب ماؤں کی کوکھ سے پیدا ہونے والے بیٹے اور کاپڑے کے دریچوں پر رکھے ہوئے شیونگ برش ہمیشہ پیچھے جائیں گے لیکن ان کی روح کا درد کون دیکھے گا؟



## تعارف

میاں، میں کتابوں کے تعارف کی بات نہیں چھیڑوں گا، حالانکہ بعض کتابوں کا تعارف کرانا اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا کسی لڑکی سے تعارف حاصل کرنا۔ یہ مسئلہ مردوں اور مردوں، یا مردوں اور خاتموں سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا، کیوں کہ اس امر سے سب واقف ہیں کہ مردوں یا عورتوں کو اپنی ہی جنس کے افراد سے تعارف کے سلسلے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ یں اس وقت صرف اس تعارف اور اس کی مشکلات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جو مجھے لڑکیوں سے جان پہچان بڑھانے کی کوشش کرتے وقت پیش آتی ہیں۔

عمر چالیس برس ہونے کو آئی، مگر ابھی تک میری شادی نہیں ہوئی۔ دیر صرف یہ ہے کہ محبت کی شادی کرنا چاہتا ہوں، دوستوں، بزرگوں اور اجاروں کو بیچ میں لانا نہیں چاہتا۔ اور محبت کرنے سے پہلے تعارف کا ہونا ضروری ہے بعض

دوستوں نے یہ بھی صلاح دی ہے کہ پہلے محبت کر لو، بعد میں تعارف ہوتا رہنے گا، لیکن مجھے یہ کچھ ایسا ہی لگتا ہے کہ پہلے اسپرو حاصل کر لو، بعد میں سر درد ہوتا رہے گا۔ میری اس بات کو اسپرو کا اشتہار نہ سمجھا جائے۔ یہ روگ میں نے آج تک نہیں پایا۔ جس شخص نے چالیس برس تک عشق نہ کیا ہو اسے سر درد بھلا کیا ہو گا، دراصل بات یہ ہے کہ اس معاملے میں کچھ لوگ پیدائشی خوش قسمت ہوتے ہیں، کچھ لوگ بد قسمت ہوتے ہیں۔ میرا شمار دفتر کے دوسرے درجے کے لوگوں میں کیا جانے لگا ہے، حالاں کہ میں اپنے دوسرے دوستوں کو دیکھتا ہوں کہ گھر پر ایک بیوی رکھنے کے علاوہ ہر اتوار کو کسی نئی لڑکی کے ساتھ وکٹوریہ گارڈن میں بھی گھومتے نظر آتے ہیں اور میرا یہ حال ہے کہ جب بھی وکٹوریہ گارڈن گیا، مجھے درختوں کے علاوہ کسی اور سے تعارف حاصل نہیں ہوا۔ اگر یہ اپنی اپنی قسمت کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر ہمارے ہاں ایک پرانی کہاوت ہے

”خدا جسے چھتر بھاڑ کر دیتا ہے۔“

مجھے بھی ایک روز اس مسئلے کا حل مل ہی گیا گو چھتر بھاڑ کر نہیں ملا، ایک پارسل بھاڑ کر ملا، جس کے اندر سے ایک کتاب نکلی۔ کتاب کا عنوان تھا ”لڑکیوں سے تعارف حاصل کرنے کے باون طریقے۔“

میرے ایک دوست بشیر نے مجھ سے ایک کتاب پڑھنے کی سفارش کی تھی مگر میں چونکہ اسے اس معاملے میں اپنا ہمارا نہیں بنانا چاہتا تھا، اس لئے میں نے اس سے یہ کتاب مانگنے کی بجائے خود اسے دی پی سی سے منگوانا بہتر سمجھا۔ میں مانگے تانگے کی محبت کا قائل نہیں ہوں۔ حالاں کہ لوگ کہتے ہیں کہ جس زملے

میں تانگے ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں تانگے کے پیچھے اپنی سائیکل دوڑا دینے سے کبھی کبھی محبت حاصل ہو جاتی تھی۔ مگر آج کل مانگے سے محبت کیا ایک مٹھی ریت تک نہیں ملتی۔ اور تانگے رہے نہیں اور آج کل سائیکلوں کے پیچھے اپنی سائیکل دوڑانا ایسا ہی ہے۔ جیسے مجنوں کا جنگل میں جا کر یل یلی پکارنا۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ مجنوں یلی کے گھر کے سامنے جا کر اس کا نام پکارنے کی بجائے جنگل میں جا کر کیوں چیتا تھا۔ شاید اس زمانے میں تمام عاشقوں کی کوپڑی اٹھی ہوا کرتی تھی۔ ورنہ فریاد اکیلا تیشہ لے کر نہر نکالنے کیسے نکل پڑتا۔ قیاس غالب ہے کہ اس زمانے میں بلڈوزر نہ ہوا کرتے تھے۔ نہ پنج سالہ پلان بنتے ہوں گے۔ آج کل پرانے طریقوں پر عمل کر کے عشق نہیں کیا جاسکتا آج کل کی لڑکی نہر کھودنے کو نہیں کہتی، ٹائی لان کی سٹری مانگتی ہے۔ جنگل میں چنچ چنچ کر اپنا نام سننے کی بجائے باغ کے کسی کونے میں دھیرے سے اپنے کانوں میں اپنا نام سننا پسند کرتی ہے۔ مگر میں بھی کہاں سے کہاں بہک گیا یہ سب تو تعارف سے بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تعارف تو ہوا ہی نہیں۔ صرف کتاب حاضر ہے اور لڑکی غائب ہے۔

رات بھر جاگ کر کتاب ختم کی۔ بہت عمدہ کتاب ہے۔ مصنف نے نئے دور کے ماڈرن مصنفوں کی طرح اس کتاب پر بہت محنت کی ہے۔ اس نے گیارہ ہزار لڑکے لڑکیوں کے سائنٹریو لے کر ان سے اپنے نتائج اخذ کئے ہیں اس طرح یہ کتاب اور اس کے باون طریقے لڑکا کے باون گزے واقعی کی طرح زندگی کی ٹھوس حقیقتوں اور ٹھوس تجربوں پر مبنی ہیں۔ اب ان پر عمل کرنا اور ان سے

فائدہ اٹھانا میرا کام ہے کتاب کے اندر اور باہر کے ڈسٹ کو رپر جگہ جگہ بہت سے ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جہنوں نے اس کتاب سے فیض حاصل کر کے ایک (یا ایک سے زیادہ) لڑکی حاصل کر لی۔ اب تک اس کتاب کی تیس لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ حالانکہ نوے صفحے کی اس کتاب کی قیمت سترہ روپے ہے۔ خود مصنف نے اس ایک کتاب سے لاکھوں روپے کی رائٹنگ وصول کر لی ہے۔ اب اس کے چھ مکان ہیں۔ دو کتے ہیں اور سات مصاحب ہیں۔ معاف کیجئے غلطی ہو گئی۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ دو مصاحب ہیں اور سات کتے ہیں۔ اور پچھلے سال اس نے اپنی پانچویں بیوی کو طلاق دی ہے۔ غرض جس پہلو سے دیکھئے وہ ایک کامیاب کتاب کا کامیاب مصنف ہے۔ سنا ہے مالی ورڈ میں اس کتاب کی بنیاد پر ایک فلم بھی بن رہی ہے مگر میرا ارادہ کوئی فلم بنانے کا نہیں ہے میں صرف ایک خوبصورت لڑکی سے تعارف چاہتا ہوں۔

کتاب کے مصنف نے کتاب کے شروع میں بہتر صفحوں کا ایک تعارف لکھا ہے کتاب کے تعارف میں مصنف نے اس بات پر بہت زور دیا ہے اور بار بار دیا ہے۔ کہ کسی بھی لڑکی کا تعارف حاصل کرنے سے پہلے اپنے دل میں حوصلے اور ہوس، بہت اور ڈھٹائی، برجستگی اور شگفتگی کا پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ جہاں تک ہوس کا تعلق ہے، اس کی مجھ میں کمی نہیں ہے، بقیہ صفات کے لئے مجھے اپنی شخصیت کا جائزہ لینا پڑے گا۔ اور اس استمان سے گزرنا پڑے گا۔ جو ان باون طریقوں میں مذکور ہے۔

طریقہ نمبر ایک:۔ مصنف کہتا ہے کہ دنیا میں صرف آپ ہی اکیلے نہیں ہیں



ہیں۔ لڑکیاں بھی اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا محسوس کرتی ہیں۔ غم ذات اور خوفناک تنہائی کا احساس آج کل کے شکستہ سماج میں، جس کی قدیم رات دن ٹوٹتی جا رہی ہیں (دن میں کم اور رات میں زیادہ) خوب صورت سے خوب صورت لڑکی بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ وہ بھی سچی محبت کی اتنی ہی پیاسی ہے۔ جتنے آپ ہیں۔ ایسی لڑکی اکثر سورج ڈوبنے سے کچھ عرصہ پہلے آپ کو باغ کے کسی گوشے میں بچہ پر بیٹھی ہوئی مل جائے گی۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی کتاب پڑھ رہی ہو، یا ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے کسی سوچ میں ڈوبی ہو۔ یا پھوٹتی ہوئی شفق کے نارنجی بادلوں کو دیکھنے میں مصروف ہو۔ مگر حاصل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر وہ کتاب پڑھ رہی ہے تو اس کا دھیان اپنی کتاب میں نہیں ہے۔ اگر اس نے اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھی ہے۔ تو سوچنے کے لئے نہیں۔ خوب صورت لڑکیاں کچھ سوچا نہیں کرتیں۔ یہ کام مردوں کا ہے۔ اور اگر وہ شفق کی طرف سے دیکھ رہی ہے تو بھی اپنے دل میں اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا سمجھ کر اداس سی محسوس کر رہی ہے۔

ایسے میں بچہ پر اگر کوئی دوسرا بیٹھانہ ہو (یعنی اس کی ماں، بھائی، عاشق یا شوہر) تو آپ بہت کم کے اس بچہ پر بیٹھ جائیے۔ پانچ منٹ تک خاموش بیٹھے رہیے۔ لڑکی کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ اس سے لڑکی کو بڑا سکون اور اطمینان حاصل ہوگا۔ اس کے بعد اپنی گھڑی دیکھئے۔ اور پلٹ کر بڑی رسائی سے پوچھئے :-

”آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے؟“



ظاہر ہے وہ اس معمولی سے سوال کا جواب ضرور دے گی۔ پھر آپ اپنی گھڑی درست کرنے میں لگ جائیں۔ اور گھڑی درست کرتے کرتے اپنی امداد اس کی گھڑی کا موازنہ نہ کیجئے۔ اس کی گھڑی کون سی ہے؟ کتنے جیول کی ہے؟ کس دکان سے خریدی ہے؟ اور پھر آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کہاں پڑھتی ہیں؟ یا کیا کرتی ہیں؟ پھر کچھ اپنا ذکر کیجئے اور ذکر کرتے کرتے غم ذات اور لوٹتے ہوئے سماج کی تہائی پر آجائیے۔ دو چار شعر پہلے ہی اذہر کر لیجئے۔ ممکن ہے کام آئیں۔ لیجئے ہو گیا تعارف۔

اندھیرے میں روشنی کی کرن چھوٹی۔ ایک راستہ نظر آیا۔ میں ہر روز باغ میں جانے لگا۔ اور اس تہنارٹ کی کوتلاش کرنے لگا۔

آخر ایک شام مجھے وہ لڑکی تہنا مل ہی گئی۔ وہ ایک بچہ پر اکیلی بیٹھی تھی۔ اُنق میں ڈوبتے سورج کی لالی دیکھتے ہوئے اس کا چہرہ گلناہ ہو رہا تھا۔ میں اس کے قریب بچہ پر بیٹھ گیا۔ لڑکی پہلے کچھ کسمائی، پھر یہ دیکھ کر کہ میری توجہ اس کی طرف نہیں ہے۔ اطمینان سے بیٹھی رہی۔ میں نے پانچ منٹ تک انتظار کیا پھر اس کے بعد اپنی گھڑی دیکھ کر بڑی راسخیت سے پوچھا، "آپ کی گھڑی میں کیا بجاہے؟"

وہ بولی، "جو آپ کی گھڑی میں بجاہے۔"

میں یہ جواب سننے ہی چکرا گیا۔ اس جواب کی مجھے امید بھی نہ تھی۔ مصنف نے اس کا کہیں ذکر نہ کیا تھا۔ اب آگے گفتگو کیسے ہو؟ چند لمحوں کے لئے میں دم بخود ہو گیا۔ اس کے بعد میرے ذہن میں وہ سوالات آگئے جن کا ذکر مصنف نے

ترکیب نمبر ایک میں کیا تھا۔ یعنی آپ کی گھڑی کون سی ہے؟ کس دکان سے خریدی تھی وغیرہ وغیرہ؟ مگر میرے سوال کتنے سے پہلے ہی وہ لڑکی پنج سے اٹھ گئی۔ اور ترکیب نمبر ایک بے کار ہو گئی۔ اب میں تھا اور غم ذات بگروہ کم بخت مجھ سے دور چلی جا رہی تھی۔ یکا یک اس کے قریب کی بوگن ویلیا کی جھاڑی سے ایک لمبا ترنگا نوجوان نکلا۔ اس کے ہاتھ میں بوگن ویلیا کے چند پھول تھے۔ اس نے لڑکی کو وہ پھول پیش کئے۔ لڑکی نے بوگن ویلیا کے پھولوں کی ایک تیلی سی پھولوں بھری شناع دوہری کز کے اپنے جوڑے کی دینی کی طرح اڑس لی اور اس نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے چلی گئی۔

ترکیب نمبر ۲۔ مصنف نے اس ترکیب کی کامیابی پر بہت زور دیا ہے اور کئی مثالیں دے کر اس ترکیب کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ یہ ترکیب عورت کی اس کمزوری کی بناء پر افذ کی گئی ہے۔ جسے روپے پیسے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ بازار میں چلے جا رہے ہیں۔ بازار میں، یا گلی کے موڑ پر یا کسی سینما کے قریب اور آپ کے آگے یا پیچھے وہ جس سے تعارف مقصود رہنے چلی جا رہی ہے یا چلی آ رہی ہے۔ آپ اپنی چال فوراً کم کر دیجئے۔ یہاں تک کہ وہ آپ کے قریب سے گزر جائے۔ پھر آپ اپنے پرس سے دس کا ایک نوٹ نکال کر اسے آواز دیجئے۔ ”اے سینے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دس کا نوٹ آپ کے پرس سے گرا ہے“

مرد میں سے ننانوے لڑکیاں اپنا پرس کھول کر اور اس کے اندر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر کہیں گی: ”جی ہاں یہ نوٹ میرا ہے۔“ تھینک یو۔

آپ دس کانوٹ اسے دیجئے اور اس کے ساتھ چلتے چلتے، باتیں کرتے ہوئے اسے کسی کافی ماؤس میں اپنے ساتھ کافی یا چائے پینے کی دعوت دیجئے آپ نے دس روپے کانوٹ تھمایا ہے، یقیناً وہ آپ کی شکر گزار ہو گی۔ اور چائے کی ایک پیالی آپ کے ساتھ پینے سے انکار نہ کرے گی۔ لیجئے تعارف ہو گیا اور صرف تعارف ہی مشکل ہوتا ہے۔ آگے کی منزلیں بہت آسان ہوتی ہیں۔

اُردو بازار سے دریا گنج کی طرف جاتے ہوئے مجھے وہ لڑکی مل گئی۔ لڑکی سے میری مراد ایسی لڑکی ہے جسے میں چاہ سکتا ہوں۔ خوب صورت، نازک اندام دلکش چال والی۔ وہ میرے آگے آگے جا رہی تھی اور میں اسے دل میں سراہتا ہوا اس سے چند قدم کے فاصلے پر چل رہا تھا۔ پھر میں نے اپنی چال تیز کر دی اور اس کے قریب سے گزر گیا۔ آگے جا کر میں نے اپنی رفتار دہمی کر دی اور وہ لڑکی اپنا سبز رنگ کا پرس جھلاتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئی۔ میں نے اسے جانے دیا۔ ابھی چند قدم ہی وہ مجھ سے آگے گئی ہو گی کہ میں نے اسے آواز دی۔

”ذرا سنیے تو۔“

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس وقت میں سڑک سے دس روپے کے دو نوٹ اٹھانے میں مصروف تھا۔ میں وہ دونوں نوٹ اٹھا کر اس کے قریب گیا اور ہاتھ بڑھا کر وہ دونوں نوٹ اسے دے کر بولا، ”غالبا آپ کے پرس سے گرے ہیں۔“

اس نے اپنا ہٹوہ کھولا۔ لکل اسی طرح اندر بھانکا جس طرح مصنف نے لکھا

تھا، اور سرسری نگاہ ڈال کر بولی، میرے بٹوے کا بٹن ڈھیلا ہو گیا ہے۔ اسی لئے گر گئے ہوں گے۔ لیئے۔ شکریہ۔

اس دل رُبانے ایک خاص انداز سے میری طرف مسکرا کر دیکھا، اور دونوں نوٹ لے کر اپنے پرس میں ڈال لئے۔ بٹوے کو زور سے بند کیا اور چلنے لگی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اور جلدی جلدی اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

”بٹوے کا بٹن ڈھیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

”جی ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“

”ڈھیلا بٹن بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔“

”وہ کھلی کھلا کہہ رہی ہیں۔“

”میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟ میں نے اس سے کہا۔“

”وہ بولی،“ میں نے بھی آپ کو دیکھا ہے کہیں۔ لیکن یاد نہیں آ رہا ہے کہ

کہاں دیکھا ہے۔“

”آپ شاید سیکرٹریٹ میں کام کرتی ہیں۔“

”جی نہیں۔۔۔ میں تو۔۔۔۔۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتے، بلکہ دوڑتے

ہوئے بولی، ”کناٹ پلیس جانے والی بس آگئی۔ مجھے وہاں جانا ہے۔ اچھا

مٹینک یو۔“

”وہ آپک کہ بس میں سوار ہو گئی۔ چند لمحوں کے لئے میں بھونپکا سا رہ گیا۔“

پھر سوچا، مجھے بھی کناٹ پلیس چل دینا چاہیے۔ مگر بس نکل چکی تھی۔ ذرا ٹھہرے

کہہ کر میں نے چلتی بس کے پائیدان پر پاؤں رکھنے کی کوشش کی۔ یکایک میرا پاؤں پھسل گیا اور میں زمین پر گر گیا میری کہنی پھل گئی اور تپکون پیچھے سے پھٹ گئی۔ گرتے گرتے میں نے دیکھا کہ بس کی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی وہ لڑکی زور زور سے ہنس رہی تھی۔ لیجئے بس بھی گئی۔ لڑکی بھی گئی۔ ساتھ میں میرا دو ہفتے کا راشن بھی گیا۔

مصنف نے ترکیب تو اچھی لکھی تھی لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اگر ایسے موقع پر بس آجائے تو کیا کرنا چاہیے۔

ترکیب نمبر ۳: مصنف کے خیال میں یہ تیر بہدف نسخہ ہے، اور کبھی بے کار نہیں جاتا۔ ایک آٹو گراف بک خرید کر لائیے، اسے ہمیشہ اپنی جیب میں رکھئے اور اس پر دو چار فلمی ستاروں کے آٹو گراف (اگر اصلی ملیں تو اصل، ورنہ جلی سہی) لے کر یا اپنے مختلف دوستوں سے لکھوا کر رکھ لیجئے۔ پھر کسی اعلیٰ قسم کے ریسٹوران میں گھسن جائیے۔ اور ٹیبل پر بیٹھ کر چائے، کافی کا آرڈر دیجئے۔ اطمینان سے چائے پیتے ہوئے ادھر ادھر نگاہ ڈالئے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کی نظر کسی ایسی ٹیبل پر پڑ جائے۔ جہاں کوئی خوش شکل خوش ادا لڑکی، اکیلی بیٹھی ہوئی نظر آجائے۔ غور سے دیکھئے۔ انتظار کیجئے۔ کہ وہ کہیں کسی دوسرے آدمی کا انتظار تو نہیں کر رہی ہے۔ چند منٹ گزر جانے دیجئے۔ پھر اپنی ٹیبل سے اٹھ کر اس کی ٹیبل تک جائیے۔ جیب سے آٹو گراف بک نکال کر کیجئے۔

میرے خیال میں آپ ہی مشہور فلم سٹار سادھنا ہیں۔ براہ کرم اس آٹو گراف بک پر دستخط کر دیجئے۔



وہ لڑکی یقیناً خوش ہو جائے گی۔ آج کل اگر کسی بھی خوش ادا لڑکی کا موازنہ کسی مشہور فلمی اداکارہ سے کیا جائے تو اس سے بڑھ کر اس کی تعریف نہیں ہو سکتی وہ یقیناً مسکرائے گی اور انکار میں سر ہلا کر کہے گی: جی نہیں۔ میں سادھنا نہیں ہوں۔ میرا نام شیلہ سلوانی ہے۔

آپ آٹو گراف بک ذرا سا اور آگے بڑھا کر اس کی طرف جھک کر کہیے۔  
غضب کی مشابہت ہے آپ میں اور سادھنا میں۔

پھر آپ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ جائیے، اور اس لڑکی سے کہیے۔

بلکہ میرے خیال میں تو آپ مس سادھنا سے زیادہ حسین ہیں۔ خوب صورتی اور دل کشی کے اعتبار سے چار نمبر آگے ہی ہوں گی۔ لائیے، اپنے ہاتھ سے اس آٹو گراف بک پر دستخط کر دیجئے۔ آپ فلم میں کیوں نہیں جاتیں؟ کیا کرتی ہیں آپ؟ آپ کیلئے چائے مگناؤں یا کافی یا آئس کریم؟ آپ کی پسندیدہ آئس کریم کونسی ہے، ایک دفعہ جو گفتگو شروع ہو گئی تو پھر تعارف ہی نہیں، تعارف سے آگے والا سلسلہ بھی چل نکلے گا۔ لڑکی کا بل خود ادا کیجئے۔ کسی خوب صورت لڑکی سے تعارف حاصل کرنے کے لئے اتنے مصارف تو برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔ یہ ترکیب مجھے پسند آئی تھی۔ اس فلم تازہ نمائے میں ہر حسین لڑکی اپنے آپ کو کسی مشہور فلم اداکارہ کا بدل سمجھتی ہے۔ کوئی اپنے کالنج کی سائرو بالو ہے کوئی اپنے گردپ کی وحیدہ رحمان ہے۔ کوئی اپنے محلے کی بیتا ہے۔ اور جو اپنے علاقے میں زیادہ مشہور بھی نہیں ہے وہ بھی آئینہ دیکھ کر خود کو کسی نہ کسی فلمی

اداکارہ سے اپنا مقابلہ کیا کرتی ہے۔ چاہے مصنف کی نگاہ میں اور آئینہ کی نظر میں اور آپ کے ذہن میں بھی دور دور تک اس کا کوئی شاہد نہ ہو کہ آپ کی محبوبہ کی شکل فلاں اداکارہ سے ملتی ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں آپ صاف صاف جھوٹ بول جائیے۔ وہ اس تعریف کو ہضم نہ جائے گی بلکہ تعریف کرنے والے کو نہ صرف مسرت بھری بلکہ تعریفی نگاہوں سے دیکھے گی۔

پھر بھی میں نے یہ سوچا کہ اگر واقعی کوئی ایسی لڑکی مل جائے جس کی شکل و صورت سچ مح کسی قدر غلطی اداکارہ سے مشابہت رکھتی ہو، تو میری غلط فہمی کے لئے ایک معقول حواز مل جائے گا۔ اور تعارف میں زیادہ آسانی رہے گی۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے جلد ہی کوالٹی ریسٹوران کے ایک کونے میں ایک ایسی لڑکی مل گئی جو کسی قدر نئی غلطی اداکارہ کد چکانی سے ملتی جلتی تھی۔ ایک ذرا سی جھلک، ایک ہلکی سی مشابہت، اور میرا کام بن گیا۔ وہ اس وقت تھی بھی اکیلی۔ ایک کونے میں ٹھنڈے دودھ میں کیلے کے قندے ملا کر چھپے ملا رہی رہی تھی کہ میں نے اپنی جیب سے آٹو گراف بک نکالی اور خوشی سے غالیچے پر تقریباً ٹھٹھا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا، اور اس کی میز پر جھک کر کہنے لگا، "معاف کیجئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ ہی کد چکانی ہیں۔" مشہور فلمی اداکارہ !

وہ لڑکی اپنے گلاس میں چھپہ پلاتے ہوئے مسکرائے گی۔ میں نے سوچا تو آخر میرا کام آج بن ہی گیا۔ اب وہ اپنا اصلی نام بتائے گی۔ اور اس کے آگے

جو کچھ ہو گا وہ میں نے مصنف کی کتاب سے ازبر کر ہی رکھا تھا۔

وہ آہستہ سے سر ہلا کر بولی، ”جی ہاں! میں ہی کد چگانی ہوں۔ شوٹنگ پر دلی آئی تھی۔ تین گھنٹے کے بعد واپس بھٹی چلی جاؤں گی۔“

اس نے میری آٹو گراف بک واپس لے لی، اور اس پر دستخط کر دیئے۔

”یعنی کہ۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔ آپ ہی۔۔۔ گویا کہ پچ پچ آپ ہی کد چگانی ہیں؟“

میری زبان لڑکھڑانے لگی۔

”کیوں؟ کیا آپ کو کسی اور کا شبہ ہو رہا ہے؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”جی نہیں۔“ میں اس کے سامنے کرسی اپنی طرف گھسیٹ کر بیٹھنے ہی والا تھا

کہ اس نے مجھے ٹوکے ہی کہا، ”معاف کیجئے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ چند لمبے ہتھائی کے چاہتی ہوں۔“

”مگر ذرا سینے تو میرا نام۔۔۔۔۔ میں نے ڈھٹائی سے کام لیتا چاہا،

کیوں کہ مصنف نے اس کی تلقین کی تھی۔“

لیکن لڑکی نے میرا نام تک نہ سنا۔ بدستور اسی تلخ لہجے میں کہنے لگی، ”اگر

آپ اپنے آپ نہیں جائیں گے تو مجھے میجر کو بلوانا پڑے گا۔“ اتنا کہہ کر وہ پھر سکرا

دی اور میری آٹو گراف بک مجھے واپس کر دی۔

میں چپ چاپ یہ سوچتا ہوا اپنی ٹیکل پر واپس چلا آیا کہ مصنف کو اس ترکیب

کو ذرا زیادہ تفصیل سے بیان کرنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔

ترکیب نمبر چار: مصنف بیان کو ”ایہ کہ آپ“ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ لوگ

یعنی سبز مین لوگ گھروں میں صابن، ٹوٹھ پیسٹ کے نمونے لے کر جاتے ہیں اور

اپنے خاص صابن یا لوتھ پیسٹ کی تعریف کے علاوہ صابن کی ایک چھوٹی سی ٹیکیا، جس سے چھ ماہ کے چھوٹے بچے کا مونہہ بھی مشکل سے دھل سکتا ہے نمونے کے طور پر گھر والی کو دے آتے ہیں۔ مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ اب تک سات ہزار نو سو اٹھتر عاشق اس ترکیب کو استعمال کر کے کامیابی سے ہکنار ہو چکے ہیں۔ اس ترکیب کو آزمانے کے لئے عاشق کو سیلز مین بننا پڑتا ہے۔ اور خود محبوب کے گھر جانا پڑتا ہے۔ آپ کو اس کے لئے صرف یہ کرنا ہو گا کہ ایک خاص قسم کا سیلز مین کا ڈریس سلوانا ہو گا، اور اس کے ساتھ اپنے بیگ میں میک اپ کا پورا سامان لے جانا ہو گا۔ فیل کریم، پاؤڈر، فونڈیشن اور وینشنگ کریم، روڈر، وغیرہ وغیرہ۔ میک اپ کا مکمل سامان لے جائے کسی مشہور میک اپ کمپنی کا سامان ہونا چاہیے۔ اس میں غرض تو ضرور ہو گا۔ کیوں کہ چھوٹے چھوٹے نمونے لے جاتے کی بجائے آپ کو پورا اور اصلی سامان لے جانا پڑے گا۔ یہ سامان آپ اپنی محبوبہ کے حوالے کر دیں گے، اور کہیں گے۔

آپ اسے مفت استعمال کر سکتی ہیں۔ اس کی لاگت بھی کمپنی نہ لے گی۔ البتہ ایک ہفتے یا (پانچ دن) کے بعد سیلز مین، یعنی بندہ پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گا۔ اور ہر پانچویں دن (یا ہفتہ میں ایک بار) حاضر ہو کر اس امر کا جائزہ لیتا رہے گا کہ موجودہ میک اپ سے آپ کو دوسرے میک اپ کے مقابلے میں زیادہ فائدہ ہو رہا ہے کہ نہیں۔ تسلی بخش نتائج کی صورت میں آپ کا سرٹیفکیٹ

حاصل کرے گی، جسے آپ کی تصویر کے ساتھ بڑے بڑے اخباروں

میں چھاپا جائے گا۔۔۔۔۔

مصنف نے اس ترکیب کی کامیابی سو فی صدی یقینی بیان کی ہے۔ یعنی یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ آپ کی محبوبہ میک آپ کے اس جال میں نہ آئے اور آپ کی تقدیر نہ کھل جائے۔

اس نئی ترکیب پر میں نے بے حد محنت کی۔ ہلکے نیلے رنگ کی کیب کے علاوہ ایک بلس شرٹ اور تیلون سلوائی۔ کیپ اور بلس شرٹ پر ایک چوکور فائے لکے انڈر میکس فیکٹر، جلی اور ابھرے ہوئے حروف میں کڑھوایا۔ میک آپ کا سارا سامان اکٹھا کیا اپنے دفتر کے ایک دوست کی بیوی سے میک آپ کرنے کے طریقوں سے آگاہی حاصل کی۔ (چنانچہ دفتر میں یہ مشہور ہو گیا کہ میں جلد ہی کسی گاؤں کی لڑکی سے شادی کرنے والا ہوں، جسے میک آپ کرنا نہیں آتا۔)

اس ترکیب کے سیکھنے اور اس کے لئے تیاری کرنے میں پورا ایک ماہ لگ گیا۔ ودی پر اتنی روپے خرچ ہوئے۔ دوسروں کے میک آپ کا سامان آیا۔ مگر اس عرصے میں کہیں بے کار نہیں گھوما۔ برابر اپنی محبوبہ کو ڈھونڈتا رہا ایسی جو حسین، نازک بدن، سیم تن، دل دبا اور دل کش ہو۔ اور کہیں کسی فلیٹ میں اکیلی رہتی ہو۔ اور غیر شادی شدہ ہو۔

بے حد تلاش کے بعد مجھے ایک لڑکی مل ہی گئی۔ وہ ہر روز ہاتھ بڈنگ کے گراؤنڈ فلور کے ایک فلیٹ سے نکل کر صبح صبح دفتر جانے کے لئے اپنے بلس



سے اڑے پر آتی تھی۔ ہمیشہ اکیلی آتی تھی، اکیلی جاتی تھی۔ کبھی اس کو کسی کے ساتھ  
ہنیں دیکھا۔ رنگت میں صباحت، چال میں قیامت۔ قدم قدم پر آفت  
جگاتی تھی۔

اُسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔۔۔۔۔ یہی ہے وہ۔۔۔۔۔ یہی

ہے وہ۔۔۔۔۔

ایک سہ پہر کو میں نے اس کے دروازے کی گھنٹی بجائی تو وہ شروع نارنجی  
رنگ کا ایک پتلا سا گون پہنے دروازے پر آئی۔ پہلے چند لمبے تو خاموشی میں  
گزرے کیوں کہ اس کے نارنجی گون سے اس کا سنہرا بدن چھن رہا تھا، اور میں  
اسے دیکھنے میں مبہوت تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کسی قدر تنک کر بولی،  
”فرمائیے۔“

”میں نے اپنے بیگ کی طرف اشارہ کر کے اُسے ذرا جھلاتے ہوئے کہا،

”میں آپ کے لئے بیگ اپ کا سامان لایا ہوں۔“

”مگر میں نے تو آپ کو بیگ اپ کے سامان کا آرڈر نہیں دیا تھا۔“

”جی ہاں! آپ درست فرما رہی ہیں۔ دراصل میری کمپنی نے مجھے آپ

کے ہاں بیگ اپ کا سامان دے کر بھیجا ہے، تاکہ آپ اس کی مفت ٹرائی

کر سکیں۔“

پہلے تو وہ کچھ جھجک رہی تھی۔ لفظ ”مفت“ پر چونکی۔ پھر اس نے میرے

لئے دروازہ کھول دیا اور مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ میں بیگ کھول کر

اسے سامان دکھانے لگا۔ جو واقعی بے حد بڑھیا تھا۔ اور اس گل بدن کے

گلاب جیسے کھلتے ہوئے بول سے خوشی کی ہلکی ہلکی سی آوازیں نکل رہی تھیں اور میں اس کے پتلے نائی لان کے ناٹ گون سے پھنتے ہوئے بدن کو دیکھ دیکھ کر اپنے جذبات میں سہجان آتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

لیکایک وہ سامان اٹھا کر ایک آئینے کے سامنے گئی، اور ہونٹوں پر لب شک کی ٹرائی کرنے لگی۔ پھر بولی، مگر یہ لب شک مجھے نہیں چاہیے۔ اس کا رنگ بہت کھل رہا ہے۔ بہت سمجیدہ رنگ ہے یہ۔

”مجھے کوئی شوخ رنگ چاہیئے؟“

”دوسری لب شک لے آؤں گا۔ کل ہی لے آؤں گا۔“

”اور آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ سامان ایک آپ کا میرے لئے ہے، اور میں اسے مفت حاصل کر سکتی ہوں؟“

”جی ہاں!“

”مگر اس سے کمپنی کو کیا فائدہ ہوگا۔“

”اگر یہ سامان آپ کو پسند آگیا تو کمپنی آپ سے ایک سرٹیفکیٹ حاصل کرے گی اور اس سرٹیفکیٹ کو آپ کی تصویر کے ساتھ بڑے بڑے اخباروں میں جلی حرف کے ساتھ چھاپے گی۔“

”آپ کا نام؟“

”انور ادھا“

”مجھے بنارس داس کہتے ہیں۔“

”مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔“

”آپ کا نام آپ کے دل ہی کی طرح خوبصورت ہے۔“

میرے دل میں جسارت اور ہمت کی ترنگیں سی اٹھنے لگیں۔ ”اور یہ تاریخی رنگ کے شفاف ٹائٹ گون میں آپ کا سنہرا بدن جامِ انخوانی کی طرح جھلکتا ہوا۔۔۔۔۔“

”اے سٹر، آپ حد سے آگے بڑھے جا رہے ہیں۔“ انورادھا ایک دم غصے سے بھڑک کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے۔ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔“ پھر انورادھا نے آواز دی۔

”ڈارلنگ!“

اندکے کسی کمرے سے ایک نوجوان باہر نکلا۔ چھوٹا اونچا، چوڑا چکلا سینہ۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹی میں بندھا تھا۔ اور چہرے پر بھی دو جگہ تیل پڑے تھے اور ایک جگہ پلاسٹک کا کراس لگا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ مشہور باکسر شواج تھا۔ جو آل انڈیا باکسنگ چیمپئن میں اسلم کیانی سے کل ہی مارا تھا۔ مگر زخمی ہونے کے باوجود غماں مگر ادا کھائی دے رہا تھا۔

انورادھا نے آنکھوں میں آنسو جمع کر کہا، ”ڈارلنگ اس نے میری بے عرقی کی ہے۔“

میں نے جلدی سے بیگ سیٹنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ باکسر نے ایک ”مگا میرے“ دائیں رخسار پر مارا، دوسرا بائیں طرف۔ میں نے فرش پر گرتے ہی اپنی کیپ اٹھائی تو انورادھا نے اپنی

چپل اٹھائی۔ پھر یکایک میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ مکمل بلیک  
اؤٹ۔۔۔۔۔

آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا۔ آج دو ماہ ہسپتال میں رہ کر میں باہر نکلا ہوں  
اور سیدھا اس مصنف کے گھر جا رہا ہوں۔ جس نے رڑکیوں سے تعارف حاصل کرنے  
کے باون طریقے لکھے ہیں۔

اگر کل کے اخبار میں آپ کسی مصنف کے قتل کئے جانے کی خبر پڑھیں تو  
آپ کو ذرا بھی تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

## رونا

مشکے مشہور ہے گانا اور رونا کسے نہیں آتا کہنے کو تو پہلے ہیکن جہاں تک اسے  
 کر دکھانے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس معاملے میں بالکل پھسڈی واقع ہوئے ہیں۔ ہم  
 سے مراد ساری انسانی برادری ہے کبھی آپ نے اس حقیقت پر غور کیا ہے کہ جوں جوں  
 ہم عمر میں بڑے ہوتے جاتے ہیں گانا تو غیر کبھی کبھی سن لیتے ہیں اور اگر کوئی قریب نہ ہو تو گانا  
 بھی لیتے ہیں جیسے کبھی کبھی نہانے کے کمرے میں یا کسی سنان سڑک پر چلتے ہوئے لیکن  
 رونا جو ہمارے بچپن کا ایک مرغوب و محبوب مشغلہ ہے اب پسندیدہ ناکاہوں سے نہیں  
 دیکھا جاتا۔ بڑے ہو کر اسے قریباً قریباً بھلا دیا جاتا ہے ابھی کل ہی میرے ایک دوست ذکر  
 کر رہے تھے کہ آخری بار جب وہ روئے تھے، اس موقع کو اب قریباً دو سال کا عرصہ گزر  
 چکا ہے۔ اس دن میرے ایک قریبی دوست کی موت ہوئی تھی۔ پھر میری طرف دیکھ کر  
 ایک آہ بھر کر کہنے لگے: "آج کل نہ تو کوئی عزیز دوست مر رہا ہے نہ ہی کسی رشتہ دار کی موت



ہوئی ہے تاکہ چار آنسو بہا کر جی ٹھنڈا کر لیا جائے۔ کبھی کبھی یہ نہی رونے کو جی چاہتا ہے لیکن پھر سوچتا ہوں، لوگ کیا کہیں گے۔

رونا کیوں اس قدر پسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ ہر شریف انسان اسے برا سمجھتا ہے اور بزدلی کی نشانی۔ درحالیکہ رونا ایک فطری فعل ہے بلکہ انسان کا سب سے پہلا فطری فعل ہے اور اکثر حالتوں میں سب سے آخری بھی۔ گانا بے شک اچھی چیز ہے لیکن رونا اس سے ہزار درجہ بہتر۔ بچپن میں ہم گاتے کم تھے اور روتے بہت بچپن میں جب ہم روتے تھے تو اکثر بار بار ہچکارنے پر بھی چپ نہ ہوتے تھے بلکہ کئی لوگ ہچکارتے بھی نہ تھے وہ کہتے تھے اچھا ہے خوب روؤ رونا بچوں کے لئے مفید ہے۔ لیکن اب عجیب حالت ہے اگر کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو کر ابدیدہ ہو جائے تو لوگ اسے بزدل و نادمہ مزاج، پست سمجھتے ہیں۔ اگر کسی بے چارے کی آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپک پڑیں یا ایک آدھ ٹپکی چمخ بھی منہ سے نکل جائے تو اسے بیچڑا کہہ دینے میں کوئی تامل نہیں آخر بات کیا ہے؟ ایک چیز بچوں کے لئے مفید ہے ان آدمیوں کے لئے جو اب بچے نہیں ہیں کئے لئے مضرت ثابت ہو سکتی ہے۔

حکیم لوگ بتاتے ہیں کہ رونا بچوں کے لئے مفید ہے کیونکہ اس سے چھاتی کھلتی ہے۔ پھیپڑے مضبوط ہوتے ہیں آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر آنکھ کی پتلیوں کو صاف کرتے ہیں ناک کے مقنوں سے ریشہ جاری ہو کر باقاعدہ تنفس جاری ہوتا ہے رونے سے عضلات اور ریشوں کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔ الغرض رونا کشتی کرنے کے بعد دوسری بہترین ورزش ہے پھر اس سے محض بچے ہی کیوں فائدہ اٹھائیں۔ سوال ہے کہ کیا ہمیں چوڑی چھاتیوں اور مضبوط پھیپڑوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے خیال میں اگر بچپن میں ان چیزوں کی ضرورت

معتی تو اب جوانی یا بڑھاپے میں تو اس کی ضرورت بہت شدید ہو جاتی ہے۔ غالباً پچھلے دن رات رونے کی ہی وجہ سے تپ دق نہیں ہوتا اگر ہم لوگ بھی دن میں دہن مرتبہ رو لیا کریں تو جہاں پیٹھ پڑے مضبوط ہوں دماغ نہ دھڑکے نہ کام آنکھوں کی بینائی بھی ٹھیک رہے کتنے بچے چشمہ لگاتے ہیں اور کون سا بوڑھا یا جوان ہے جو چشمے کی حاجت نہیں محسوس کرتا لوگ اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے سدھ کر دھون، گولڈ پلیر، مارا لیم شربت فولاد استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان قیمتی دواؤں کی بجائے قدرت کے بیش ترین اصول برتیں اور دن میں صرف ایک آدھ گھنٹہ جی بھر کر رو لیا کریں تو جہاں جسم طاقت ور رہے وہاں دن بھر دل میں امن ہے گا اور وہ انتشار و اس بیسیوں صدی میں ہر فرد کے دل میں پایا جاتا ہے خود بخود مٹ جائے۔

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ رونا صحت کے لئے کس قدر مفید ہے۔ رونا جسم کی غذا ہے نہ صرف جسم بلکہ روح کی غذا بھی۔ ایسی مفید عادت کے لئے اور اسے بڑے پیمانے پر رائج کرنے کے لئے عالمگیر پروپیگنڈے کی ضرورت ہے اس کے لئے جگہ جگہ ادبی مجلسوں کی طرح رونے کی مجلسیں قائم کی جائیں۔ سکولوں اور کالجوں میں رونا لازمی مضمون قرار دیا جائے ایسی فلمیں دکھائی جائیں جہاں بڑے بڑے آدمی رورہے ہوں مثلاً ہٹلر، موسلینی، چیاگانگ کائی ٹیک، بڑے بڑے آدمیوں کو اس طرح دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھ کر عوام پر بہت اچھا اثر پڑے گا اور وہ بھی بے اختیار رونے لگ جائیں گے اور تصور کیجئے ایک بڑا سینما مال ہے جہاں ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے زور زور سے رورہے ہیں۔ کتنا تو بصورت منظر ہے کیا یہ آپ کے شاعرانہ جذبات کو متحرک نہیں کرتا؟ یا پھر ہانکی، کشتی، فنٹ بال کی طرح رونا بھی بطور ایک ورزش سکھایا جائے۔ ہر شام کو شہروں اور دیہاتوں کے قریب میدانوں میں

لاکھوں افراد کھڑے کئے جائیں جو چھین مار مار کر روئیں اور اپنی صحت کو بہتر بنالیں۔ اچھے اچھے رونے والوں کے ریکارڈ بھرے جائیں ملک موسیقی کی طرح ملک گریہ رونے کا بادشاہ وغیرہ وغیرہ اس پروگرام کو مقبول بنانے کے لئے سینکڑوں طریقے برتے جاسکتے ہیں صرف نمونے کے لئے چند ایک یہاں درج کئے ہیں تاکہ سندرہ ہے۔ باقی طریقوں کے لئے ڈیڑھ روپے کے ٹکٹ بھیج کر الراقم سے خط و کتابت کریں۔

رونے کی مختلف قسمیں ہیں بچوں کا رونا تو آپ دیکھ چکے ہیں۔ لیکن بعض بچے بہادر اور ویر ہو جاتے ہیں۔ وہ اکثر گھنٹوں کئی کئی دن روتے رہتے ہیں کھانا بھی کھاتے ہیں کھیلتے بھی ہیں اور درمیان میں ہچکیاں لے لے کر لگا لگا روتے رہتے ہیں ایسے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ بڑے ہو کر یہ کیا کر سکیں گے۔ یوں بھی تو بذات اللہ یہ کوئی کم کارنامہ ACHIEVEMENT نہیں اور میں تو اسے اتنی ہی اہمیت دیتا ہوں جتنی کہ دائرو کی لڑائی فرانس کے انقلاب اور سکندر کے حملے کو دی جاسکتی ہے۔

ٹرکین کا رونا ایسا ہے جیسے برسات کی بارش۔ ذرا استاد نے دو چار بید لگا دیئے تو رور و کر پڑی لگادی۔ ادھر ماسٹر صاحب نے پچکارا۔ ادھر تبسم نما آفتاب نکل آیا۔ پل میں بارش۔ پل میں دھوپ لیکن ایک رونے پر ہی کیا موقوف ہے۔ ٹرکین میں ہر کام ایسا ہوتا ہے جیلت لہندی اور حیرت انگیزی اڑدوں کی، بس ان کا نام ٹرکین ہے، اور شباب تو اس سے بھی بڑا ہے اول تو لوگ جوان ہو کر روتے ہی نہیں، اگر روتے ہیں تو بہت کم اور اس جگہ جہاں کوئی نہ دیکھ پائے نہ سن سکے۔ جیسے کسی گناہ قبیح کے مرتکب ہو رہے ہیں یونہی کبھی کبھی رسم آنگھوں سے دو چار آنسو ٹپکا دیئے جاتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی دبی ہوئی پیچ، لیکن شاذ و نادر۔

بڑھاپے میں بھی یہ لوگ روتے ہیں مگر اس طرح روتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہنسی اُتی ہے  
 بھلا یہ بھی کوئی رونا ہے کہ ہو ہو ہو کر کے لبوں پر جھاگ لاکر آنسوؤں سے سفید سفید ڈھل  
 کوڑ کر لیا جائے یہ رونا نہیں بلکہ رونے کی بھی ہنسی اڑانا ہے۔ دراصل داناؤں نے تھیک  
 کہا ہے کہ بڑھاپے میں عقل ٹھکانے نہیں رہتی یوں بھی تو اس میں بوڑھوں کا کیا تصور  
 ہے دراصل یہ لوگ عطائی ہوتے ہیں۔ رونے کے فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں اگر رونا انہوں  
 نے بطور فن یا ورزش کے سیکھا ہوتا تو بہت یہاں تک پہنچتی۔

رونا ایک فن ہے رونا ایک ورزش ہے رونا ایک آرٹ ہے موزاڈ کر کو بچوں اور  
 عورتوں نے خوب سمجھا ہے اور اپنایا ہے میں نے وہ بچے دیکھے ہیں جو اس طرح سسکیاں  
 بھر کر روتے ہیں کہ آدمی کا جی خود بخود ان کی طرف کھینچ جاتا ہے دل میں ترقم اور ہمدردی  
 کا جذبہ عمیق موجزن ہو جاتا ہے اور وہ انہیں بازوؤں میں اٹھا کر بچکارنے پر مجبور ہو جاتا ہے  
 اور عورتیں! رونے کے آرٹ کو اگر دنیا میں کسی نے بہترین صورت میں پیش کیا ہے تو وہ  
 عورت ہے عورت کے رونے نے ملکوں اور قوموں میں انقلاب پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک  
 قلو پطرہ، ایک ہیلن ایک منر سمپنس، آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے ایک نئی  
 نگاہ اور شاید آج دنیا کی تواریخ مختلف ہوتی اگر تاریخ بچے ہر صفحے پر کسی عورت کے دوچار  
 آنسو نہ چپکے پڑتے۔ یوں بھی عورت کے آنسوؤں کی بدولت کروڑوں گھروں میں ہر ساتویں  
 دن ایک معاشرتی انقلاب آ جاتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کمبخت مرد رونا نہیں  
 جانتے اور عورتیں آنسو بہا کر ہمیں ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیتی ہیں وقت آگیا ہے کہ دنیا  
 کے مرد اٹھیں اور اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس دام فریب  
 کو پارہ پارہ کر دیا جائے کہ جس نے ہم عزیز مردوں کو یوں جکڑ رکھا ہے اٹھو جاہلو! اٹھو

سرفروشی کی تمنا غیر عینِ یاد رکھیے ہماری آزادی کی بہتر صورت روتا ہے۔ خوب روڈ ۔  
 جی بھر کر روڈ دن میں بار بار روڈ اگر عورت کے چار آنسو دنیا میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں  
 تو مرد کے آنسو کیا نہ کر سکیں گے۔



## شیطان کا استعفا

ایک دفعہ شیطان خدا کے روبرو حاضر ہوا اور سر جھکا کر بولا "میرا استعفا عاقر ہے؟"  
"کیوں کیا بات ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔"

"میں اس کام سے عاجز آ گیا ہوں۔" شیطان نے ننھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا: ہر  
سودر لوگوں کو جہنم کی آگ میں جلانا، لہو اور پیپ کے کڑواؤ میں ابالنا، چابک مار مار کر ان  
کی کھال ادھیرنا، ہر لمحے لوگوں کو گناہوں پر اکسانا، کتنا مشکل کام ہے میرا۔ اور جب سے  
دنیا بنی ہے جب سے یہ کام میں کر رہا ہوں، اور اب میں یہ کام کرنے کرتے ننھک گیا  
ہوں۔ ذرا غور کیجئے بار الہا سب سے مشکل کام تو مجھے سونپا گیا ہے۔ ورنہ تیرے دوسرے  
فرشتے تو دن رات جنت کی ٹھنڈی ہوائیں کھاتے ہیں۔ تیری عبادت میں مگن رہتے ہیں  
اور ہر لحظہ لوگوں کو نیکی کا درس دیتے ہیں۔ کیا عمدہ و خوبصورت اور دلچسپ کام ہے  
ان کا۔ یا خدا، میرے مالک، میرے گاڈ، میرے بھگوان، رب عظیم! میں لوگوں کو گناہوں

پر اکساتے اکساتے تھک کر ٹوٹ چکا ہوں میرا استعفا قبول کر اور مجھے اس روزِ روز کے جہنم سے نجات دے؟

یہ کہہ کر شیطان دوزخ تو ہو گیا اور خدا کے قدموں میں لیٹ کر گر گڑا، گر مارا کر رونے لگا۔ خداوند کریم کے دل میں رحم آگیا، انہوں نے اپنے فرشتوں اور ملائکہ سے مخاطب ہو کر پوچھا: کیا کہتے ہو تم لوگ؟

شیطان کی آہ و زاری سے فرشتوں کے دل ایسے چکے تھے مگر آگے بڑھ کر کچھ کہنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ آخر کار ڈرتے ڈرتے جبرائیلؑ نے اتنا کہا۔

”تو رحیم ہے، کریم ہے، واقعی شیطان کو اس کی گستاخی کی سزا پل چکی ہے، مجھے اس پر رحم آتا ہے۔“

خدا نے جبرائیلؑ سے پوچھا: کیا تم اس کی جگہ کام کرو گے؟

جبرائیلؑ نے دست بستہ عرض کی میں نیرا پیغام رساں ہوں۔

میکائیلؑ بولا: میں روزی رساں ہوں۔

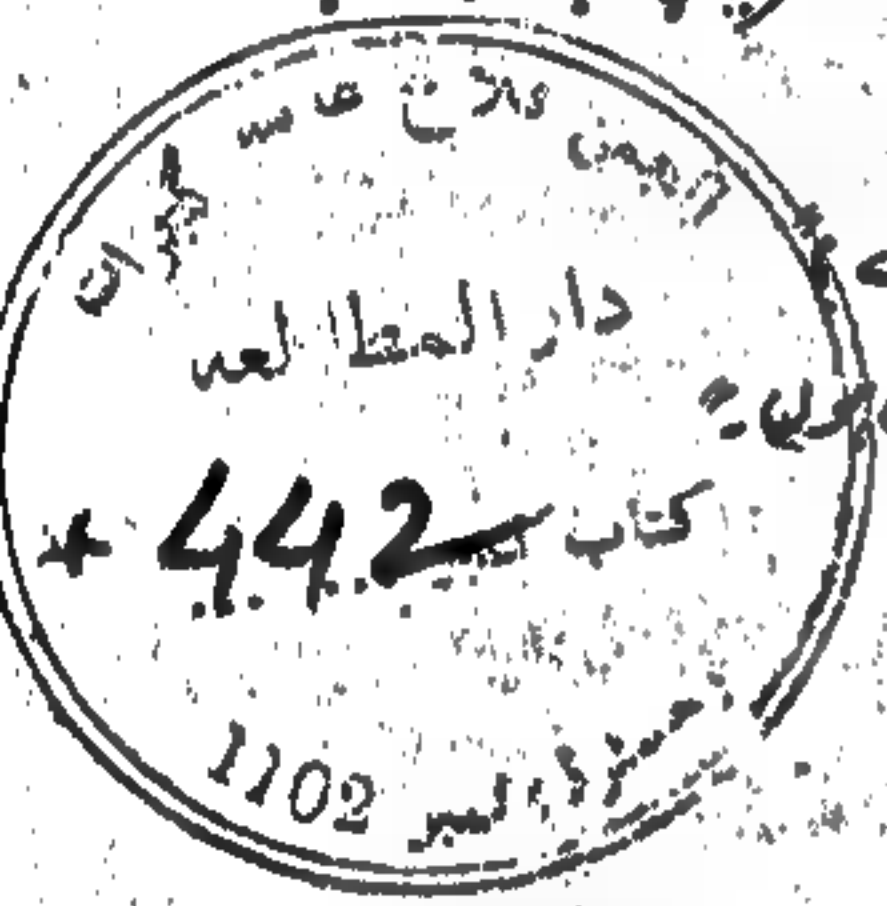
اسرائیلؑ بولا: میں صور پھونکتا ہوں۔

عزرائیلؑ بولا: میں روح قبض کرتا ہوں۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو روح قبض کرتا ہے اس کو ہم آج سے جہنم کی نگرانی پر مقرر کرتے ہیں اور شیطان کو آزاد کرتے ہیں، اس کے پاس کو واپس کر دو۔

جب شیطان کو اس کے پر واپس مل گئے تو خدا نے اس سے کہا: ”آج سے تو فرشتہ ہے۔ آج سے تو ہر ایک کونیک کا سبق دے گا۔ اس وقت تو میدانِ حایہاں سے چلا جا

موضع مکشمن تین، جہاں کرم دین کسان کی لڑکی زہرا کا سودا ہو رہا ہے۔ جا کر فوراً اس



سو دے کو روک دے۔“

شیطان نے ایک معمر سفید وارھی والے بزرگ کا بھیس بدلا اور موقع لکشمی تین کرم دین کسان کے گھر پہنچ گیا اور اسے سمجھانے لگا: ”اگر تم نے اپنی لڑکی بھی تو تم پر خدا کا قہر نازل ہو گا۔“

”اس وقت تو بیٹے کا قہر نازل ہے۔ کرم دین بالوی سے سر ملاتے ہوئے بولا۔  
”اگر میں اپنی لڑکی نہ بیچوں تو زمین بیچوں گا اور اگر زمین بیچوں گا تو میں اور میری بیوی اور میری پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے کھائیں گے کہاں سے؟ تم نے یہاں کی زمین دیکھی ہے سخت اور پتھریلی اور بھر بھری لال مٹی والی اس زمین میں مکا اور باجھ سے کسوا کچھ نہیں ہوتا۔ دن رات محنت کے بعد بھی ایک وقت فاقے سے گزرتا ہے اب اگر زمین بھی بیچ دیں گے تو بیدھے بیدھے مرجائیں گے۔ کیا تم پانچ لڑکیوں اور دو لڑکوں اور ایک بیوی کے قتل کے ذمہ دار بننے کے لئے تیار ہو؟“

شیطان نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔

”تو تم مجھے سمجھانے کی بجائے لالہ مصری شاہ کو سمجھاؤ جو ہمارے گلاؤں کا بنیاد ہے اور جس کا ساڑھے سات سو روپے کا قرضہ واجب الادا ہے، اگر وہ قرضہ مجھے معاف کر دے گا تو میں اپنی لڑکی زہرا کا سوا نہیں کروں گا۔“

شیطان نے اپنے ماتھے پر تنک کا نشان لگایا۔ گروے رنگ کی ایک دھوئی پہنی کاندھے پر رام نام کا انگوچھا رکھا اور ہاتھ میں مالالے کہ لالہ مصری شاہ کے گھر پہنچ گیا لالہ مصری شاہ اس وقت اپنے گھر کے آگن میں تلسی کی پوجا سے فارغ ہو کر کھاٹ پر بیٹھے ہی تھے کہ شیطان نے آنکھ جگائی۔

اس کی بات سن کر لالہ مصری شاہ اپنے لہجے میں مصری گھولتے ہوئے بولے: پتہ نہ  
 جی آپ کیوں بار بار بھگو ان کا نام لے کر مجھے ڈرا رہے ہیں۔ لڑکی کا سودا میں نہیں کر رہا  
 ہوں۔ کرم دین کر رہا ہے۔ اس کی سزا جزا گناہ و ثواب وہ بھگتے گا۔ میں کیا جانوں مجھے  
 ساڑھے سات سو روپے چاہئیں۔ میرا قرضہ واپس کر دے بس وہ جانتے اس کا کام۔  
 لیکن اگر تم اس کے ساڑھے سات سو روپے معاف کر دو تو وہ اپنی لڑکی نہیں بیچے  
 گا۔ شیطان نے اسے سمجھایا!

”کس کس کا قرضہ معاف کروں؟“ غیبی تے اپنی لال کتاب اسے کھول کر دکھائی۔  
 یہ چوڑی دیکھئے سند داس سے دو ہزار لیتے ہیں۔ جمائے پانچ سو ساٹھ روپے  
 گورویال سے آٹھ سو روپے اور مہتاب رائے تین ہزار کھائے بیٹھلے۔ اس گاؤں  
 کے کسانوں پر میرا کیس ہزار کا قرضہ مع سود نکے لکھا ہے۔ جب سب کو معاف کر دوں  
 گا تو خود کھاؤں گا کہاں سے اور گھر کیسے چلاؤں گا؟

”تم اور کسی کا قرضہ نہ معاف کرو صرف اس کا کہ دو جو تمہارے قرضے کی وجہ سے اپنی  
 لڑکی کا سودا کرنے پر مجبور ہے۔“

”مجبور تو میں ہوں۔ میں تے دوپن چکیوں کے لائسنس کی درخواست دے رکھا ہے۔  
 اور مجھے اس لائسنس کے لئے ساڑھے سات سو روپے سات دن کے اندر راندہ سرکاری  
 خزانے میں داخل کرانا ہو گا کرم دین کسان کی زمین کی قرتی کے کاغذات میرے پاس ہیں  
 اگر اس نے چار دن کے اندر راندہ روپیا واپس نہ کیا تو میں اس کی زمین قرتی کر کے اپنے  
 لائسنس کا روپیا بھر دوں گا۔“

شیطان نے بالا جیتے ہوئے کہا: تم کو شرم نہیں آتی لالہ مصری شاہ ان پر، سو

روپیوں کے عوض تم ایک مسلمان لڑکی کو اپنے گھر میں لاؤ گے۔ اپنا دھرم بھڑٹ کر دے؟  
 "رام رام کنسی باتیں کرتے ہو پندت جی۔ لالہ مصری شاہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے  
 ہوئے بولا۔ میں ایسی قبیح حرکت کو تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لڑکی کو میں اپنے گھر  
 نہیں لا رہا ہوں۔ اصل میں اس لڑکی کا سودا خواجہ بدرالدین سے ہو رہا تھا جو کشمن تین  
 کے پل پار آڑھت کی دکان کرتا ہے اس کی چار بیویاں پہلے سے موجود ہیں، مگر اس پر بھی  
 زہرا کے لئے ساڑھے سات سو دینے کے لئے تیار ہے۔ سودا صرف اتنا ہے کہ کرم دین  
 ساڑھے سات سو کے عوض خواجہ بدرالدین کو اپنی لڑکی اور کرم دین اپنے قرضے کے  
 عوض ساڑھے سات سو مجھے دے گا اور میں اپنے لائسنس کے عوض۔  
 "بس بس۔ شیطان گھبرا کر بولا۔ یہ بتاؤ کیا یہ گندہ سودا کسی طرح رک نہیں سکتا؟  
 "خواجہ بدرالدین چاہے تو رک سکتا ہے۔ اس کو پانچویں شادی کرنے کی ضرورت کیا  
 ہے چار تو اس کے گھر میں پہلے سے موجود ہیں وہ اگر شادی نہ کرے تو یہ سودا آسانی سے  
 رک سکتا ہے۔"

مگر میں کہاں پانچویں شادی کر رہا ہوں؟  
 خواجہ بدرالدین آڑھت نے شیطان کو سمجھایا۔  
 "یہ درست ہے کہ میری چار بیویاں ہیں، مگر سب سے پہلی عمر رسیدہ ہو چکی ہے  
 گھر کا کام تک نہیں کر سکتی میں اس کا مہرا داکر کے اس کا خرچہ باندھ کے اس کو الگ کر  
 دوں گا اور تب زہرا سے شادی کروں گا۔  
 "مگر تمہاری عمر پینسٹھ برس کی ہو چکی ہے اس بڑھاپے میں تم کیوں شادی کرنا چاہتے  
 ہو؟ شیطان نے اس سے پوچھا۔"



چار بیویوں سے آج تک کوئی لڑکا پیدا نہیں ہوا سب ہی لڑکیاں جنتی ہیں :  
خواجہ بدرالدین مالپوسی سے بولا : مجھے لڑکا چاہیے اپنا نام لیوا۔ خاندان چلاتے

والا ۔

یہ فردی نہیں ہے کہ زہرا سے لڑکا ہی پیدا ہو۔ شیطان نے کہا : اللہ بڑا کارساز  
ہے : خواجہ بدرالدین نے اتفاقاً پر اٹھا کے کہا : وہ مجھے ضرور میری مراد دے گا۔  
شیطان نے پھر لوچھا : کیا کسی طرح یہ سودا نہیں رک سکتا ؟  
کیوں۔ زبردستی کا سوا تو ہے نہیں جناب :

خواجہ بدرالدین نے کسی قدر تلخی سے کہا : لڑکی بالغ اور جوان ہے اپنا بڑا بھلا خود  
سوچ سکتی ہے۔ اگر لڑکی اس شادی کے لئے راضی نہ ہو تو میں یا اس کا باپ اسے شادی  
کے لئے کبھی مجبور کر سکتے ہیں ؟

شیطان نے ایک خوب روگبرو کا بھیس بدلا اور زہرا سے ملنے چلا گیا جو اس وقت  
نکی ڈھکی کی بیویوں کے سائے میں ایک ٹھنڈے چشے کے کنارے بیٹھی ہوئی گھڑا بھری  
نقہ، پہلی، نظر میں ہی وہ اس گبرو نو جوان پر عاشق ہو گئی، اس کے سنہری گالوں پر حیا  
کی گلابی رنگت بکھر گئی اور وہ لہجہ کر چشے میں پڑے ہوئے گھڑے کو اپنی انگلیوں سے  
گھمانے لگی۔

شیطان نے اسے شادی کا پیغام دیا۔  
زہرا گھڑا گھماتے رک گئی۔ نظر بھر کر اس نے نو جوان کی طرف دیکھا، پھر اس نے  
اپنی آنکھیں جھکائیں اور بڑی کمزور آواز میں بولی :  
”کیا کام کرتے ہو ؟“

”کچھ نہیں کرتا۔ شیطان بولا۔ خدا کا نام لیتا ہوں!“

”خدا کا نام تو نسب ہی لیتے ہیں۔ زہرا اُداس ہو کر بولی۔ پھر تم مجھے کھلاؤ گے کیسے؟“  
”ہم دونوں مل کر محنت کریں گے!“

”محنت تو میں نے ہمیشہ کی ہے۔ اپنے ماں باپ کے گھر میں اور کھیتوں میں۔ آج تک دن رات محنت کرتی آئی ہوں اور اس محنت نے مجھے پٹے چتھڑے اور ایک وقت کا فاقہ دیا اس محنت سے اب عاجز آ چکی ہوں۔“

شیطان دیر تک چپ رہا۔ پھر آہستہ سے بولا:

”زہرا تم جوان اور خوبصورت ہو ذرا سوچو تو تم اس پیسٹھ برس کے بڈھے سے شادی کر کے خوش رہ سکو گی۔ کیا تمہاری روح کو اس امر سے اطمینان ہو گا کہ تم ایک انسان ہو کر چاندی کے سکوں کے عوض فروخت کی جا رہی ہو؟“  
”وہ مجھے گھروں سے گا، داؤ وقت پیٹ بھر کے روٹی تو دے گا۔“ زہرا کا چہرہ امید سے کھل گیا۔

”مگر وہ بڈھا بد صورت پیسٹھ برس کا۔“

شیطان نے زہرا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: ”ذرا سوچو تم اس سے کیسے خوش رہ سکو گی؟“

زہرا نے آہستہ آہستہ اپنی لابی لابی پلکیں اوپر اٹھائیں اور غور سے لگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی: ”خوش ہونے کے لئے میں کبھی کبھی تم سے مل گیا کروں گی آؤ گے نا مجھ سے ملنے کے لئے چھپ کے؟“

زہرا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے اپنا سینہ اس کے سینے پر رکھ دینا چاہا،

مگر شیطان جلدی سے ہاتھ چھڑک کے بھاگ گیا۔ وہ تھانے وار گور دیال سنگھ کے پاس پہنچا اور اس سے کہنے لگا: میں ایک شریف شہری کی حیثیت سے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس سودے کو روک دیکھئے اور ایک لڑکی کی زندگی تباہ ہونے سے بچا لیجئے۔ تھانے وار صاحب! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ موضع گلشن تپن کا کسان کرم دین اپنی لڑکی کا سودا خواجہ بدرالدین سے کر رہا ہے۔ ساڑھے سات سو روپے لے کر وہ اپنی لڑکی کی شادی خواجہ بدرالدین سے کر دے گا اور زہرا کو پا کر خواجہ بدرالدین ساڑھے سات سو روپے کرم دین کو دیے گا جو یہ ساڑھے سات سو روپے لے کر لالہ مصری شاہ کو دے کر اپنی زمین چھڑکے گا کیا انسان کی روح اب مویوں اور بیگنوں کی صورت میں بھی جائے گی۔ اخلاقی اعتبار سے یہ سودا غلط ہے مذہبی اعتبار سے یہ گناہ عظیم ہے۔ قانونی اعتبار سے بھی یہ مجرم ہے۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں آپ اس علاقے کے تھانے وار ہیں آپ اس خلاف قانون سودے کو روک دیکھئے۔ میں ہرگز نہیں روکوں گا۔ تھانے وار نے شیطان کو سمجھایا: مجھے سارا قصہ معلوم ہو چکا ہے اور میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے مجھے معلوم ہے کہ جب زہرا کا نکاح خواجہ بدرالدین سے ہوگا اس سے چند منٹ قبل خواجہ بدرالدین ساڑھے سات سو روپے اپنے ہاتھ سے اپنی ہونے والی بیوی کے ہاتھ میں دے گا۔ زہرا وہ رقم لے کر اپنے باپ کے ہاتھ میں دے گی۔ نکاح کے بعد وہی رقم لے کر کرم دین لالہ مصری کے پاس جائے گا اور وہی ساڑھے سات سو روپے دے کر اپنا فرزند چکائے گا، مگر میرے آدمی خواجہ بدرالدین کے نکاح کے وقت موجود ہوں گے، اور جو روپیہ خواجہ بدرالدین اس سودے کے عوض دے گا اس پر پہلے سے ہمارے خفیہ نشان بنے ہوں گے پس جب

نکاح ہو جائے گا تو میں ایک ہی ہلے میں سب کو گرفتار کر دوں گا اور ان پر دختر فروشی کے سلسلے میں مقدمہ چلاؤں گا۔

”مگر آپ مقدمہ کیوں چلاتے ہیں؟ شیطان نے پریشان ہو کر کہا: آپ اس خلاف قانون حرکت کو عمل میں آنے سے پہلے ہی کیوں نہیں روک دیتے؟

”بڑے چند ہیں آپ! گور دیال سنگھ تھانیدار نے مجھ کو کہا: میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اتنے بڑے مقدمے کو یوں آسانی سے بات سے جانے دوں جس میں خواجہ بدرالدین اور مصری شاہ اور کریم دین اور زہرا کو میں ساتھ لپیٹ میں لے سکوں۔ خواجہ بدرالدین سے میں کم از کم دو ہزار روپے رشوت میں لے لوں گا اور اتنی ہی رقم لالہ مصری شاہ سے اینٹھ لوں گا، پھر میں نے سنبھلے زہرا ہدیت خود بصورت لڑکی کا ہے۔ مگر یہ تو گناہ ہے۔ شیطان نے گھبرا کر کہا۔

”ان چار ہزار روپوں سے میں اپنی لڑکی کی شادی کر سکوں گا۔ بڑی بچی کی شادی ایک سو سے لڑکی ہوئی ہے۔ مجھے اس کے جہیز کے لئے معقول رقم چاہیے، اب ایک ہی ہلے میں سب بندوبست ہو جائے گا۔

”ایک لڑکی کی شادی کے لئے آپ دوسری لڑکی کی زندگی تباہ کریں گے۔ یہ تو پاپ ہے۔ اور شہرت الگ لے گی جناب!“ تھانیدار نے شیطان کو سمجھایا: اتنا بڑا مقدمہ آج تک اس علاقے میں کسی تھانیدار کے ہتھے نہ چڑھا ہو گا۔ ممکن ہے کہ اس مقدمے کی کامیابی کے بعد میں انسپکٹر بنا دیا جاؤں۔ یہ تو جرم ہے۔ شیطان چلتا ہوا۔

”آپ بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہیں!“ تھانے دار نے گرج کر پوچھا۔

”میں خدا کا بندہ ہوں۔ شیطان نے عاجزی سے سر جھکا کر کہا: ”لوگوں کو نیکی کا درس دیتا ہوں؟“

تھانے دار نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ سات دن کے بعد حوالات سے چھوٹ کر شیطان خدا کے حضور میں پہنچا اور اپنے پیر واپس کرنے لگا۔

”کیا بات ہے؟“ اللہ تعالیٰ نے پوچھا۔

”شیطان نے کہا: میں نے سوچا تھا کہ میرا کام سب سے مشکل ہے، اور فرشتوں کا کام سب سے آسان ہے۔ اب معلوم ہوا کہ میرا کام آسان ہے، اور فرشتوں کا کام سب سے مشکل ہے اس لئے میں اپنا استعفا واپس لیتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ مجھے فوراً جہنم پر بھیج دیا جائے۔“



## ہیرا رانجھا

ایکے روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا بالکونی کے قریب کتاب پڑھ رہا تھا اہلی بارش ہو رہی تھی کچھ گرج بھی چل رہے تھے اور بہت خوش گوار سماں تھا میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ یکایک بجلی کا ایک زور کا کوندا پسکا اور میرے دروازے کے پٹ کھل گئے کیا دیکھتا ہوں کہ —

ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت، دونوں پانی میں بھیگے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہیں کمرے میں اندھیرا ہے، آوازیں سنائی دیتی ہیں، صورت نظر نہیں آتی، رانجھا:۔ ہیرا! شکر ہے کہ اس کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

نہیں تو بارش اور جھگڑے سے بھیگ جاتے۔

ہیرا:۔ یہ کس کا کمرہ ہے رانجھا؟

رانجھا:۔ کسی کا بھی ہیرا! اپنے کو کیا لینا۔ ذرا پل کی پل رُک جائیں بارش ختم

ہو جائے گی تو چلے جائیں گے۔

ہمیر۔ کہاں

راکھا۔ وہیں ٹٹ پاتھ پر۔

ہمیر۔ راکھے! میں اسی لئے تم سے کہتی تھی اپنا گارڈن چھوڑ کر بیٹی مت چلو۔

راکھا۔ میرے گاؤں میں سب میرے دشمن ہیں کوئی مجھے نہیں چاہتا، تیرے

سوا، وہاں اگر ہم رہتے تو ہماری محبت کبھی زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔

ہمیر۔ لیکن وہاں دو وقت روٹی تو ملتی تھی اور لسی بھرا چھٹا اور مکھن سے بھرا

ہوا کٹورہ اور سرسوں کا ساگ اور کھلی فضا اور نم کبھی جوگی بن کر میرے پاس آ جاتے

تو میرے دل کے ہر کونے میں رنگین تسکیناں سی اڑنے لگتی تھیں۔

راکھا۔ اور آج چوہے دوڑ رہے ہیں پیٹ میں ونس کھا چکا ہمیر بے

لسی پیئے تو ایک عرصہ ہو گیا۔ سرسوں کا ساگ کھائے ہوئے کئی سال ہو گئے اور مکھن

یعنی مسکہ تو یہاں کھایا نہیں جاتا۔ صرف خوشامد میں لگایا جاتا ہے یا وہ جب ہم

پہلے دن اس شہر میں آئے تھے اور اس سے لسی بنانے کو کہا تھا۔ اس نے پوچھا تھا

لسی کتنے وہی کی بناؤں۔ میں نے کہا تھا اس بڑن میں جتنا وہی ہے سب کی بنا دو۔

ہمیر۔ اور وہ علوائی یہ سنتے ہی غش کھا کر گر گیا تھا۔

(دونوں ہنستے ہیں)

ہمیر۔ یہاں اندھیرا بہت ہے راکھا۔

راکھا۔ دیکھتا ہوں بتی بجلی کہیں ہوگی (سوچ دبا کر) نور روشنی ہوگئی۔

ہمیر۔ یہ بجلی بھی خوب چیز ہے راکھا! بٹن دباؤ اور روشنی ہو جاتی ہے۔ ہمارے

زمانے میں بجلی نہیں تھی۔

راکھیا :- لیکن ہمارے زمانے میں مٹن دبانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ ہم ایک لمحے میں تیرے رخ روشن سے دل میں اٹلا کر لیتے تھے۔ پھر اس روشنی پر کوئی ٹیکس بھی تو نہیں دینا پڑتا تھا۔

ہمیر :- راکھیا! مجھے بھوک لگی ہے۔

راکھیا :- تین دن سے میں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔

تین دن سے ایسی لگاتار بارش ہو رہی ہے کہ کسی کام پر بھی نہیں جاسکتا۔ اس بارش کی وجہ سے بلڈنگ باندھنے کا کام بند ہے پہلے اینٹیں ڈھولے کی مزدوری تو مل جاتی تھی، اب وہ بھی بند ہے۔

ہمیر :- غریب آدمی بارش میں کیا کرتے ہوں گے؟

راکھیا :- ہماری طرح بارش میں بھیگتے ہوں گے۔

ہمیر :- بڑی مصیبت ہے راکھیا!

راکھیا :- مصیبت تو ہے لیکن ہمت کرو تو بڑی سے بڑی مصیبت بھی کٹ جاتی ہے۔ ارے ہاں — میں تو تم سے پوچھنا بھول گیا تم اس فلم کمپنی میں گئی تھیں؟

ہمیر :- کس فلم کمپنی میں؟

راکھیا :- وہ جہاں راکھیا کا فلم بن رہا ہے۔ یعنی اپنی محبت کی کہانی!

ہمیر :- ہاں گئی تھی!

راکھیا :- ڈائریکٹر سے ملی تھیں؟

ہمیر :- ہاں ملی تھی۔

رات بھا :- پھر :-

ہیر :- وہ تو بہت ہی عجیب آدمی معلوم ہوتا ہے۔ وہاں تو سب کے سب بہت سے عجیب آدمی بیٹھے تھے۔ میں اندر داخل ہوئی تو مجھے ایسے گھورتے لگے جیسے گوالا بھوری بھینس کو گھورتا ہے۔

ڈائریکٹر نے مجھ سے پوچھا :-

یہ ایک ہیر گھوم کر اپنے بیچ کے مرکزی پردے کی طرف چلنے لگتی ہے پردے کے قریب پہنچتے ہی پردہ اٹھ جاتا ہے سامنے فلم کمپنی کا دفتر نظر آتا ہے۔ چھ سات آدمی ٹوٹے ہوئے پیالوں میں چائے پی رہے ہیں بیچ کی میز پر ایک فلم ڈائریکٹر بیٹھا ہے اس نے آوارہ ٹائپ کی تیلوں اور گہرے زیورنگ کی بشرٹ پہن رکھی تھی جوت سے وہ فلم ڈائریکٹر کا آوارہ سنگھ پہوان کا اسٹنٹ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ فلم ڈائریکٹر صاحب کو ایک سنگل چائے مارو (دوسرے آدمی سے) ہاں بھئی شرابی! آج فنا سر کے پاس جانا ہے اس احمق نے آج ڈیڑھ لاکھ روپے دینے کا وعدہ تو کیا ہے۔ ایک چوٹی ہے تمہاری جیب میں اس چائے والے کو دے دو۔ (وہ آدمی چائے ملے کو چوٹی دیتا ہے)

چائے والا :- (دیکھ کر) مگر یہ چوٹی تو کھوٹی ہے۔

ڈائریکٹر :- کوئی بات نہیں کل سے جانا اور ہاں بھئی شرابی! وہ فلم کے ٹکٹوں کا کیا بندہ دبست ہوگا؟

شرابی :- کل ہو جائے گا۔ بچو بھائی، سیٹھ اگر بھونڈو بھائی سے کہہ دے گا تو کام ہو جائے گا۔

ڈائریکٹر :- مگر بچو بھائی کیوں کہے گا ؟  
 شیر :- ان کا راستہ بھی ڈھونڈ لیا ہے وہ ہے نا اپنی سائنڈ ہیروئن مدھر بالا۔  
 (سب لوگ قہقہے لگاتے ہیں۔ ڈائریکٹر میز کے سامنے کھڑی ہیر کی طرف مخاطب ہوتا ہے)

ڈائریکٹر :- کیا کام ہے تم کو ؟  
 ہیر :- پٹاخہ فلم کمپنی کا دفتر یہی ہے ؟  
 ڈائریکٹر :- ہاں ہاں یہی ہے ۔ پھر ؟  
 ہیر :- سنا ہے کہ آپ ہیر رانجھا فلم بنا رہے ہیں۔  
 ڈائریکٹر :- ہاں ہاں بنا رہے ہیں ۔ پھر ؟  
 ہیر :- میں اس فلم میں کام کرنے آئی ہوں۔  
 ڈائریکٹر :- تم کو کیا کام آتا ہے ؟ کبھی کسی فلم میں کام کیا ہے ؟  
 ہیر :- نہیں ۔

ڈائریکٹر :- تم کو ناچنا آتا ہے ؟  
 ہیر :- نہیں ۔ لیکن ناچنے کی کیا ضرورت ہے ؟ ہیر تو نہیں ناچتی تھی۔  
 ڈائریکٹر :- تم کو کیسے معلوم نہیں ناچتی تھی ۔ ہماری فلم میں تو وہ ناچتی ہے ۔  
 کتھک :- رہا سمبھا ۔ سب ہی ناچتی ہے ۔

ہیر :- اس زمانے میں رہا سمبھا نہیں تھا ۔ !  
 ڈائریکٹر :- تم کو کیا معلوم ہے ؟ ہمارا رائٹر کیا گدھلے پھر ؟ اس نے دس کتاب  
 دیکھ کر کہانی لکھ لے اچھا یہ بات چھوڑو ۔ ہم تم سے مغز پتی نہیں کرے گا ۔ تم کو اس فلم



میں کام کرنا ہے، ہم تم کو اس قلم میں ہیر کی ماں کا پارٹ دے گا۔ بولو منظور ہے؟  
ہیر۔ ہیر کی ماں؟ مگر میں۔۔۔ میں ہیر کی ماں کا پارٹ کیسے کر سکتی ہوں؟

ڈائریکٹر۔ کیوں؟

ہیر۔ کیونکہ میں خود ہیر ہوں۔

ڈائریکٹر۔ ہیر۔ ہا ہا ہا! ادھن بھائی، سدھاکر، بی موریہ، محمود خاں! ارے  
دیکھو، خود ہیر تمہاری قلم میں کام کرنے آئی ہے۔ اسے اس کی محنت دیکھو، شکل دیکھو  
رنگ روپ دیکھو۔ ارے یہ ہیر معلوم ہوتی ہے! ہیر۔۔۔۔۔ (تہقیر)

ہیر۔ ہاں ڈائریکٹر صاحب! پچ پچ میں ہیر ہوں ہیر۔ وارث شاہ کی ہیر پانچ  
دریاؤں کی سرزمین کی ہیر، محبت اور حسن کے لازوال گیتوں کی حسین تعبیر۔  
ڈائریکٹر اور اس کے ساتھیوں کے قہقہے بڑھتے جاتے ہیں۔ ہیر کی آنکھوں میں  
آنسو آ جاتے ہیں اور وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے چپ چاپ رانجھے کی طرف دیکھ رہی ہے۔  
رانجھا۔ (آہستہ ہو کر) وہ لوگ تمہارے حسن کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہیر کے حسن  
کو کوئی رانجھا ہی دیکھ سکتا ہے (ہیر سسکیاں لیتی ہے) رانجھا اس کے قریب آ جاتا ہے،  
رانجھا۔ وہ لوگ محبت کرنے والے نہیں ہیں۔ محبت کو ایک نیتے کی طرح پیٹ  
کر بازار میں بیچنے والے ہیں بس اپنے آنسو پونچھ ڈال۔

ہیر۔ پچ کہتی ہوں رانجھا! مجھے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ اب صبر نہیں ہو سکتا  
یہاں تو سب کاغذ ہی کاغذ ہیں یہ کوئی بھوکا وکیل معلوم ہوتا ہے۔

(کھڑکی آواز)

رانجھا: بل گیا! آخر کچھ کھانے کو مل گیا۔!

ہمیر: کیا ہے؟

رانجھا: ڈبل روٹی جسے ہمیشہ کے لوگ پاؤ کہتے ہیں۔ حالانکہ وزن میں ایک چھٹانک بھی نہیں۔

ہمیر: مجھے دو!

رانجھا: ہمیرے! ذرا ٹھہرا!

ہمیر: جلدی سے دو جلدی (روٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے)

رانجھا: ذرا ٹھہر ہمیرے۔ ذرا سوچنے دے ہمیرے! یہ تو جانتی ہے کہ ہم پہلا صرف بارش سے پناہ لینے کے لئے آئے ہیں۔

ہمیر: ہاں! لیکن یہ ڈبل روٹی؟

(روٹی کی طرف بیقراری سے بڑھتی ہے رانجھا پیچھے ہٹ جاتا ہے)

ہمیر: لیکن یہ روٹی جلدی سے دے دے میں تین دن سے بھوکا ہوں۔

رانجھا: لیکن یہ پوری ہوگی ہمیرے! اگر ہم یہ ڈبل روٹی کھائیں گے تو یہ پوری ہوگی۔

ہمیر: لیکن مجھے تو سخت بھوک لگی ہے رانجھا!

رانجھا: تجھے میری محبت کی قسم ہمیرے یہ روٹی نہ کھا!

ہمیر: اب میں کوئی قسم نہیں کھاؤں گی رانجھا! میں تو صرف روٹی کھاؤں گی۔

جلدی سے یہ روٹی دے دے! (ہمیر آگے بڑھ کر روٹی چھین لیتا ہے)

رانجھا: نہیں نہیں ہمیرے! دیکھ وہ سامنے ہم دونوں کی تصویر لگی ہے کوئی

بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے آج بھی، بھوک، بیکاری اور خود غرقی کے زمانے میں اس تہ ہاری تصویر نگار کھی ہے دیکھ یہ آدمی کتنی عزت کرتا ہے ہماری محبت کی! اس کے گھر میں پوری نہیں کریں گے۔ لاٹھے روٹی واپس دے دے! میں اُسے اسی دراز میں رکھے دیتا ہوں جہاں سے اسے اکٹایا تھا۔

دھیر کبھی روٹی کو، کبھی دیوار سے لگی تصویر کو دیکھتی ہے۔ آخر میں روٹی کو واپس کر دیتی ہے۔ رانجھا میز کی دراز کھول کر اس میں روٹی رکھ دیتا ہے دھیر سکیاں لیتی ہے، رانجھا: نہ رو دھیر! میری اپنی دھیر! یہ بارش ختم جائے گی پھر مجھے کہیں نہ کہیں کام مل جائے گا۔ پھر ہم دونوں پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گے۔

بارش اور طوفان کی آواز باہر سے آتی ہے کھڑکیاں اور دیواریں بکنے لگتی ہیں، دھیر! یہ بارش کبھی نہیں ختمے گی۔ یہ طوفان کبھی نہیں ختم ہوگا۔ ہم سدا بھوکے رہیں گے۔ رانجھا: نہیں! ایک دن یہ بارش ختم جائے گی۔ ایک دن یہ طوفان ختم ہو جائے گا۔ ایک دن یہ بادل چھٹ جائیں گے اور سوزج کی روشنی ساری زمین کے سارے آنسو جو اس نے اس دن کوئی بھوکا نہ ہوگا کوئی ڈبل روٹی نہیں چرائے گا۔ اس دن ساری محبتیں نکل ہو جائیں گی۔

دونوں دروازے کی طرف چلنے لگتے ہیں۔ روشنی کی ایک کرن بالکنی سے بڑھنے ہوئے دیوار پر لگی ہوئی ہینچرا تھجے کی تصویر کے گرد ہالہ بنا دیتی ہے، (پردہ)

## گواہ

مرحوم کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟

مرحوم! حق مغفرت کہے عجب آنا درود تھا۔

مرحوم کا نام کیا تھا؟

مرحوم کا نام رام بیجا۔ خدا بخش۔ گوردیال سنگھ۔ انیسویں لالہ ابراہیم، تامل

پاؤں کر نہ تھیں لیکن مرحوم مرتے وقت صرف مرحوم ہو کر رہ گئے تھے۔

مرحوم کی عمر کیا تھی؟

مرحوم بچوں میں بچے۔ جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بیڑ کر بوڑھے بن

جاتے تھے۔ اس لئے آج تک ان کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا۔ ہاں قیاس

غالب ہے کہ مرحوم کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے بے وقت چھین

لیا۔ ورنہ مرنے کی ان کی عمر نہ تھی۔ مرحوم کی عمر کے متعلق اس سے زیادہ کسی کو

معلوم نہیں۔

مرحوم کے اوصاف و فضائل بیان کرو؟

مرحوم کے اوصاف "حسنہ" اور فضائل "جمیدہ" تھے۔ اس کے علاوہ وہ "فرشتہ سیرت"، "ٹینک طینت" اور "مرنجان مرنج" بھی تھے۔ قدرت نے انہیں "ادبی ذوق" سے متصف کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ فلک کج رفتار نے۔۔۔۔۔

اچھا۔ اچھا۔ اب یہ بتاؤ کہ مرحوم کا حلیہ کیا تھا۔

مرحوم بڑے گورے چٹے۔ وجہیہ۔ دوہرے بدن کے آدمی تھے۔ کہتے ہیں کہ بچپن میں مرحوم ایسا خوبصورت بچہ سارے شہر میں نہ تھا۔ جوانی میں مرحوم ایسا گھبرو جوان چراغ لے کر ڈھونڈھے سے نہ ملتا تھا۔ بڑھاپے میں ان کے چہرے پر ایسا نور برستا تھا کہ ان کی طرف دیکھنا بھی محال ہو چکا تھا۔ مرتے وقت لوگ دور بین یا خورد بین لگا کر دیکھتے تھے۔ جلال کا یہ عالم تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم کا چہرہ سنولایا ہوا تھا بلکہ سیاہ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ اور چہرہ کتابی تھا۔ جس سے فطری ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔

مرحوم کا باطن کیسا تھا؟

مرحوم کے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔

مرحوم کہاں رہتے تھے؟

مرحوم اسی کمرۂ ارض پر رہتے تھے لیکن جب مر گئے تو غلامِ آیشانی ہو گئے

مرحوم کی عادات کے بارے میں تم کچھ کہہ سکتے ہو؟



مرحوم بڑے وضع دار تھے۔ وضع داری کو نبھاتے نبھاتے مرحوم ہو گئے۔ مرحوم بچوں اور جوانوں سے بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے تھے اور بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔ لیکن ان میں خود داری بہت تھی۔ اس نے کبھی گھر سے باہر نہ نکلے تھے۔ مرحوم بڑے فیاض تھے لیکن اخوس کہ غریبی نے ان کے اس جوہر کو پیسنے نہ دیا۔ پھر بھی وہ اپنی ہی کرگزر تے تھے۔ مرحوم جھونپڑے میں رہتے تھے بنگلے میں رہتے تھے۔ محل میں رہتے تھے، لیکن جہاں کہیں بھی وہ رہتے تھے ہمیشہ خدا کو یاد کرتے تھے۔ مرحوم بڑے خوش گفتار تھے۔

خوش گفتار؟

جی ہاں۔ جب مرحوم بات کرتے تھے تو ان کے منہ سے بھول جھڑتے تھے۔ کیا انہوں نے اپنے منہ کے اندر بھولوں کے گلے چھپا رکھے تھے؟ جی ہاں! اور اس کے علاوہ جب وہ ہنستے تھے تو موتی بہتے تھے۔ آپ نے کتنے موتی چھنے؟

”ہزاروں! لاکھوں!“

تو پھر تو آپ بہت امیر بن گئے ہوں گے۔ کتنا انکم ٹیکس دیتے ہیں آپ؟ جی کچھ بھی نہیں۔ وہ سارے موتی میں نے ہار میں پرو کر مرحوم کی قبر پر چڑھا دیئے۔

اچھا تو کیا وہ دفنائے گئے تھے؟

جی ہاں! وہ دفنائے گئے تھے۔ جلائے گئے تھے۔ بہائے گئے تھے پھانسی پر لٹکائے گئے تھے۔ ان کے جسم کا گوشت و پوست چیل کوڑوں نے کھا

لیا تھا۔ لیکن مرتے وقت ان کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی۔ گویا زندگی نے موت پر فتح پالی ہو۔

مرحوم کا رویہ شہر کے لوگوں کے ساتھ کیا تھا؟

مرحوم کی نظروں میں ایر و غریب، تاجر و گدا، عورت و مرد سب برابر تھے۔ وہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ کلے اور گورے، بھنگی اور برہن کی تفریق سے واقف نہ تھے۔ تعصب تو انہیں چھو تک نہیں گیا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں نیک و بد کی بھی تمیز نہ تھی۔

مرحوم کا اٹھنا بیٹھنا کن لوگوں میں تھا؟

مرحوم بڑے آزاد، لا اباالی، بغیر منش آدمی تھے۔ اس لئے اکثر اکیلے ہی رہتے تھے اور چرس کا دم لگاتے تھے۔ انہیں مکروہات دنیا سے نفرت تھی۔ اس لئے زندگی میں بہت کم لوگوں نے ان سے براہ و رسم پیدا کی۔

مرحوم کے دشمنوں کو تم جانتے ہو؟

بڑی اچھی طرح سے۔ مرحوم کا سارا شہر دشمن تھا۔

اور جب وہ مرے تو۔۔۔

تو وہ اخبار بھی جنہوں نے زندگی بھر ان کے لئے ایک سطر نہ لکھی۔ پانچ کالی سٹرنی چھاپ رہے تھے۔

مگہ جگہ لکھا ہوا تھا "آہ مرحوم"۔

مرحوم نے کبھی کسی سے عشق کیا؟

مرحوم کو صرف خدا سے عشق تھا۔

مرحوم کیا پیتے تھے !  
قرض کی پیتے تھے فٹے ۔

پھر !

پھر ایک دن ان کی فاقہ مستی رنگ لے آئی اور وہ بد حال اور مفلوک الحال ہو گئے اور اُجڑے دیار میں رہنے لگے ۔  
اس وقت تم ان سے ساتھ تھے ؟

جی نہیں ۔ میں صرف نماز جنازہ میں شریک ہوا تھا ۔  
مرحوم کا اپنے ملک کے بارے میں کیا خیال تھا ؟  
مرحوم کو اپنے ملک سے بڑی محبت تھی ۔ لیکن افسوس کہ ملک نے ان کی قدر نہ کی ۔ قوم نے ان کو نہیں پہچانا ۔ ہاٹے افسوس ۔  
مرحوم کا دل کیسا تھا ؟

مرحوم کا دل بڑا احساس تھا ۔ مرحوم کا دل ایک شفاف آئینے کی طرح تھا ۔ مرحوم کسی دوسرے کو تکلیف میں دیکھ کر خوش نہ ہو سکتے تھے ۔ مرحوم کا دل چوٹ کھایا ہوا تھا ۔ ایک کافر ادا نے انہیں ایسا چرکہ دیا کہ وہ اسے عمر بھر نہ بھلا سکے اور آخر اسی رنج میں گھل گھل کر جان دے دی ۔  
اس عورت کا کیا نام تھا ؟

مرحومہ ! خدا بخشے بڑی سلیقے والی عورت تھی ۔ اس کے حسن و جمال

کا شہرہ —

مرحومہ کی بہنیں مرحوم کی بات کر دیں ۔ یہ بتاؤ کہ مرحوم کیا کرتے تھے ؟

مرحوم سب کام کرتے تھے۔ وہ شامی کرتے تھے۔ فوج میں بھرتی تھے۔ کلرکی کرتے تھے۔ بل جوتے تھے۔ دکان داری کرتے تھے۔ مزدوری کرتے تھے۔ چار پائیاں بٹنتے تھے۔ پان کی دکان کرتے تھے۔ تانگہ چلاتے تھے۔ مرحوم مصنف تھے۔ مرحوم پبلشر تھے۔ مرحوم دلال تھے۔ مرحوم کوکین فروش تھے۔ لیکن مرحوم جو بھی کام کرتے تھے۔ اُسے حد کمال تک پہنچا دیتے تھے۔ مرحوم نے اپنی زندگی میں سب کام کئے۔ لیکن جب وہ مرے تو صرف ہچکیاں لے رہے تھے۔ اور ان کے اعزہ و اقارب ان کے سر ہانے کھڑے رو رہے تھے۔

مرحوم کس طرح مرے؟

مرحوم انتقال فرما کر اس دار فانی سے رخصت ہو گئے اور پھر ان کی روح قفسِ عنبری سے پرواز کر گئی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

مرحوم کا ثانی کون ہے؟

مرحوم کا ثانی روئے زمین پر کوئی نہیں۔

مرحوم کی جگہ کون پُر کسے گا؟

مجھے تو ان کی جگہ پُر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ حضور پُر نور کی ہستی کے سوا

مجھے تو —

اچھا۔ اچھا۔ اب تم جاسکتے ہو۔

شکریہ۔

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ — ایک سوال رہ گیا ہے۔ تم مرحوم کو کب سے

جانتے ہو؟

میں؟ میں مرحوم کو اس دن سے جانتا ہوں۔ جس دن انہیں موت آئی اور وہ

مر گئے۔ آہ!

مرحوم! کیا بتاؤں۔ ع

”مذا بخشنے پہنت کی خوبیاں تھیں مرنے والے ہیں“



## بڑے آدمی

بڑے آدمیوں کی پرستش عرصہ دراز سے جاری ہے اور اس کے پس پردہ خوف کا وہ جذبہ مستند ہے جو کمزور کو قوی سے اور قوی کو قوی تر سے میسر کرتا ہے ابھی تک آدمی آدمی سے ڈرتا ہے۔ محبت نہیں کرتا۔ پرستش کرتا ہے لیکن محبت نہیں کرتا۔ پرستش اور محبت میں بہت فرق ہے۔ جب انسان جنگل میں رہتا تھا۔ تو جنگل کے دوسرے جانوروں کی طرح اس کا دل بھی شیر کی گرج سن کر دہل جاتا تھا۔ شاید اس خوف نے شیر کے دل میں دوسرے جانوروں کے متعلق ایک جذبہ تحقیر پیدا کر دیا۔ پیر اڈھر ڈر پوک جانوروں کے دل میں خوف و ہراس کے جذبے نے عمل سکوس کی صورت اختیار کر لی۔ شیر اب جنگل کی قوت کا مظہر بن گیا اور انسان اس کی پوجا کرنے لگا۔ اور ابھی تک اس کی

پوچھا کر رہا ہے۔

شیر جنگل اور شیر پنجاب ہر روز اجاروں کے کالوں میں دندناتے نظر آتے ہیں۔۔۔ ہر بڑا آدمی کسی ایک انسانی گروہ کا شیر ہوتا ہے۔ لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں اور وہ اپنے دل میں اپنی حقیر سمجھتا ہے۔ اور اکثر اس امر کا مظاہرہ کیا کرتا ہے۔ لیکن سب سے مضحکہ خیز صورت وہ ہے۔ جب شیر جنگل کے جانوروں سے ووٹ طلب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے

”میں تمہارا خادم ہوں۔“

اور جانور اس قدر بے وقوف ہوتے ہیں کہ خود خادم ہوتے ہوئے اسے اپنا خادم سمجھنے لگتے ہیں۔ اور تالیاں بجا بجا کر اسے ووٹ دیتے ہیں اور پہلے سے بھی زیادہ شیر کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔

جنگل کا شیر اور انسانوں کی بستی کے شیر اپنی صفات میں ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ دونوں شدید قسم کے انفرادیت پسند ہوتے ہیں۔ جنگل کا شیر اپنے علاقے میں کسی دوسرے شیر کو گھسنے نہیں دیتا۔ اور یہی حال انسانوں کی بستی کے شیر کا ہے۔ چنانچہ مثل مشہور ہے کہ ایک میان میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔

گاندھی جی ہندوؤں کے شیر ہیں۔ جناح صاحب مسلمانوں کے۔ اول تو اپنے جنگل میں کوئی ان کا حریف پیدا ہو تو سختی سے دبا دیا جاتا ہے۔ دوسرے جنگل سے آئے ہوئے شیر کا تو معاملہ ہی اور ہے۔ اس مرحلے پر جغرافیائی وطنیت کا فرما ہوتی ہے۔ ایک جنگل کے جانور دوسرے جنگل کے جانوروں پر پل پڑتے ہیں

اس لئے نہیں کہ خدا نخواستہ انہیں جنگل کے دوسرے جانوروں سے بیرہے۔ ہرگز نہیں! یہ تو صرف اس لئے ہوتا ہے کہ اپنے جنگل کے شیر کی عزت خطرہ میں ہوتی ہے۔ یعنی جسے ہم ڈر اور خوف کے احساس سے مغلوب ہو کر پوچھتے ہیں۔ اس کی عزت خطرے میں ہوتی ہے۔ جب یہ لڑائی شروع ہوتی ہے تو اسے بالعموم دحق و انصاف کی لڑائی کہا جاتا ہے۔

جنگل کا شیر اپنی رعایا کے خون پر گزارا کرتا ہے۔ انسانوں کی بستی کا شیر بھی اسی طرح پلتا اور پروان چڑھتا ہے۔ دونوں اپنی رعایا کا شکار کرتے ہیں اور اس کے عوض میں رعایا دن رات ان کی پرستش کرتی ہے۔ وہ کہانی تو آپ نے سنی ہی ہو گی۔ جب انسانوں کی ایک بہت بڑی بستی پر ایک دیو نازل ہوا اور شہر سے باہر ایک کھوہ میں رہنے لگا تھا۔ پھر شہر کے راجہ چھوٹے شیر سے اس نے معاملہ کر لیا تھا کہ انسانوں کی بستی سے ہر روز ایک آدمی اس کی خوراک کے لئے کھوہ میں بھیج دیا جائے گا۔ عرصہ دراز تک انسانوں کی بستی پر دیو کا ظلم مستطرد ہوا اور عرصہ دراز تک اس بستی کے گلی کوچوں سے آہ و بکا کی صدا میں بلند ہوتی رہیں۔ آخر ایک دن وہ آیا۔ ”وہ“ یعنی نجات دہندہ۔ شہزادہ د عالم۔ اور اس نے دیو سے لڑ کر اسے مار ڈالا اور اس طرح اس شہر کو دیو کے جنگل سے رہائی دلائی۔ لیکن یہ پرستان کی کہانی ہے۔ انسانوں کی بستی میں ابھی وہ نجات دہندہ نہیں آیا۔

جب انسان نے جگل سے ناطہ توڑا۔ اور وادیوں میں دریا کے کنارے

کنار سے اپنی بستیوں بسائیں۔ اور اپنے تمدن کو ترقی کی راہ پر چلایا۔ اس وقت بھی وہ شیر کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ شیر کا خوف ابھی تک اس کی روح پر مسلط ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ جنگل کا شیر، شہر کا شیر بن گیا۔ پرستش وہی رہی۔ خوف وہراس وہی رہا۔ ہلو کی ازرائی وہی رہی۔ انسان ازمنہ قدیم سے قرون وسطیٰ اور قرون وسطیٰ سے زمانہ جدید میں پہنچا۔ لیکن بڑے آدمی سے اسے نجات نہ ملی۔ قلیے داری سے سرمایہ داری اور سرمایہ داری سے جمہوریت کے آغاز کی طرف بڑھا۔ لیکن پیرتسمہ پا کی طرح یہ بڑا آدمی ہر وقت اس پر سوار ہی رہا۔ میں تمہاری قیادت کروں گا۔ میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ میرے بغیر تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم طفل مکتب ہو۔ تم جاہل ہو۔ نالائق ہو۔ دھوکہ کھا جاؤ گے۔ میں تمہارا کام کروں گا۔ میں تمہارا لیڈر ہوں۔ میرے مشورے پر عمل کرو۔۔۔۔۔

اور جب جمہوریت آئی اور انسان کے ذہن میں اجتماعی شعور اگیا ایسا لینے لگا تو شیر نے فوراً اس خطرے کو بھانپا اور پیتر ابدل کر کہنے لگا۔ میں تمہارا شیر ہوں کیوں کہ تم نے مجھے شیر بنایا ہے۔ تمہارا فیصلہ میرا فیصلہ ہے۔ میں وہی کرتا ہوں جو تم کہتے ہو۔ دراصل شیر میں نہیں ہوں۔ شیر تم ہو۔ میں تو تمہارا منہ ہوں۔ تم جب چاہو۔ مجھے ہٹا سکتے ہو۔

لیکن شیر کو کس نے ہٹایا؟ اگر کسی نے ہٹایا بھی تو وہ خود ایک شیر تھا۔ دوسرا شیر، پہلے سے قوی تر! اور انسانوں نے کہا "یہ بہت بڑا آدمی ہے۔"

سب اقسام شکستہ ہو چکے۔ لیکن یہ صنم نہیں ٹوٹا۔ ابھی تک صحیح و سلامت ہے۔ شعور و ادراک کی ترقی اور نفسی کارناموں کے باوجود بڑا آدمی — ایک آدمی — انفرادیت پسند — اقلیت پسند عالم زندہ ہے اور ہم پر حکومت کر رہا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں حکومت کر رہا ہے اور مخلوق اپنی اجتماعیت پسندی کے باوجود اس سے ذہنی جا رہی ہے۔ پس جا رہی ہے۔ اپنے ہو کا خراج ادا کر رہی ہے۔ کیوں کہ جنگل کا خوف ابھی تک اس کے ذہن کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اگر یہ خوف انسان کے دل سے نکل جائے اگر وہ یہ سمجھ لے کہ بڑا آدمی درحقیقت بڑا انسان نہیں ہے۔ اگر جنگل کے سارے جانور اتحاد کر لیں تو بڑے سے بڑا شیر جھک جائے گا اور بھگی بلی بن کر اتحادیوں کے اشارے پر چلے گا اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو خود ہی یہ جنگل چھوڑ دے گا۔۔۔۔۔ لیکن اجتماعیت پسندی ابھی اس منزل پر نہیں پہنچی۔ ابھی یہ احساس عام نہیں ہوا کہ جب ایک آدمی "بڑا" ہوتا ہے تو ہزاروں چھوٹے چھوٹے آدمیوں سے بڑا بنی جھن جاتی ہے۔ ورنہ بڑا آدمی جمہوریت پسندوں کا بڑا آدمی بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کرتا۔ ہمیں اس موقع پر یہ کہنا چاہیے۔ یہ نہیں کہنا چاہیے۔ اسے فوراً جواب مل جاتا تم کون ہو مجھے بتانے والے۔ میں خود جانتا ہوں مجھے کیا کہنا ہے۔ اس قوم کا کچھ کچھ جانتا ہے اسے کیا کہنا ہے اس ملک کا ہر فرد اپنا فرض خوب پہچانتا ہے۔ تم بھی ہماری طرح ایک آدمی ہو۔ بڑا آدمی بننے کی کوشش نہ کرو۔

لیکن ابھی تک کہیں بھی، کسی ملک میں، کسی قوم میں، یہ ردِ عمل نہیں منظر آتا۔



ہندوستان بے چارے کی تو بات ہی اور ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی جہاں انسانی آبادی نوے فی صدی تعلیم یافتہ ہے۔ بڑے آدمی پائے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد ریڈیو پر سنی جاتی ہیں۔ ان کے پیغام اخباروں میں جلی حروف میں شائع کئے جاتے ہیں۔ لاکھوں آدمی ان کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ان کے سنگار کا ایک کٹن، ان کی مونچھ کا ایک بال، ان کے جوتے کی ایک کیل، لاکھوں انسانوں کی زندگی سے زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے۔۔۔۔۔ جنگل! ابھی تک زندگی کے ہر شعبے میں اکثریت پر اقلیت کی حکومت سمجھی جاتی ہے۔ جمہوریت پسند بھی ہر بار یہی کہتے ہیں۔

”آؤ عوام میں کام کریں۔ عوام کو اپنا ہم خیال بنائیں۔“ ایک بنیادی سوال یہ ہے۔ کیوں عوام میں کام کریں۔ عوام؟ گویا تم خواص میں سے ہو۔ ایک تفریق تو اسی وقت پیدا ہو گئی۔ جب تم نے دوسروں کو ”عوام“ کہہ کر خود کو بانس پر چڑھا لیا۔ اود۔۔۔۔۔ بڑے دیوتا ہیں آپ۔۔۔۔۔ مونٹ ایورسٹ پر بیٹھے ہوئے نیچے ”عوام“ کو دیکھ رہے ہیں۔ عوام میں کام کریں! گویا عوام اپنا بڑا بھلا نہیں جانتے۔ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ جاہل سے جاہل انسانی گروہ کا فیصلہ فرد کے فیصلہ سے بہتر ہوتا ہے۔ پھر تم اپنی رائے ان پر کیوں ٹھونسے ہو۔ اقلیت کی رائے اکثریت پر، انہیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟ تم کیوں نہیں عوام کے ہم خیال ہو جاتے۔

”یہ خیال شروع میں اقلیت ہی اپناتی ہے۔“ اس طرح تو پھر انسان کو شیروں سے کبھی نجات نہیں مل سکے گی۔ دنیا کو ہمیشہ بڑے

آدمیوں کی ضرورت ہے گی۔ یہی نطشے کہتا تھا۔ یہی آج ولیزہ کہتا ہے۔ پھر وہ ہمارا عمومی فلسفہ کہاں گیا؟

حقیقت یہ ہے کہ آج تک بڑے آدمیوں نے دنیا کے لئے کچھ نہیں کیا۔ بُرائی کے سوا، اپنی برطحانی کو بڑھانے کے لئے ان سے کسی دوسرے کام کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ بشریت کی فلاح و بہبودی بڑے آدمیوں کے کارناموں میں نہیں۔ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی مشترکہ ماسعی میں بھرتی ہے۔ ہلاکو سے ہٹلر تک کسی ایک فاتح اعظم کی ذاتی خصوصیات پر غور کیجئے۔ ان کی سرشت میں خود پرستی، خود ستائی اور انسانی زندگی کی حقیر کوتاہی داخل ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ کہ لاکھوں انسان ان کی کیم پرستش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اگر ان کی پرستش کرنے اور اور ان کے لئے لڑنے مرنے کی بجائے ایک ایسا گروہ بن جائیں اور ان بڑے لوگوں کو میدان کارزار میں اکیلا چھوڑ دیں تو انسان کی صعوبتیں ایک ہی دن میں ختم ہو جائیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہلاکو اور ہٹلر کے علاوہ دنیا میں ایسے بڑے آدمی بھی ہیں جنہوں نے انسانی برتری اور بہبودی کے لئے واقعی کام کیا ہے مثلاً مفکر فلسفی، مصلح، ادیب، سائنس دان۔

لیکن میں تو انہیں بھی بڑا آدمی سمجھنے سے انکار کرتا ہوں۔ ان میں بہت سے ایسے بڑے آدمی ہیں۔ جنہوں نے اپنے فلسفے میں، ادب میں، سائنس کی ایجادات میں انسانی تخریب کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی امکانی کوشش کی ہے۔ جنہوں نے "بشیروں" کے فلسفے کو سراہا ہے اور اسی قسم کے ادب

کی تخلیق کی ہے۔ اور اسی قسم کے ہتھیار بنائے ہیں۔ جو شیروں کی حکومت کو انسانی آبادی پر زیادہ سے زیادہ عرصے تک قائم رکھ سکیں جو چند ایسے بڑے آدمی باقی رہ گئے ہیں۔ جو اس فہرست سے خارج ہیں۔ ان کے تعمیری کارناموں میں بھی ان ہزاروں چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی علمی، ادبی، سائنسی تجربات کو دخل ہے۔ کہ جن کی مشرکہ کاوشوں سے انسانی علم و فن کے خزینے بھرے گئے ہیں پھر ہم تاج محل پر آخری اینٹ لگانے والے کوتاہ عمل کا خالق کیوں سمجھیں ہیلٹ کے کردار کے لئے شیکسپیر کو کیوں سراہیں۔ کشش ثقل کے اصولوں کا خدا نیوٹن کو کیوں ٹھہرائیں؟

اگر گاندھی جی نہ ہوتے تو کیا ہندوستان میں آزادی کی تحریک نمودار نہ ہوتی؟ اگر جناح صاحب نہ ہوتے تو کیا مسلمان پاکستان کا مطالبہ نہ کرتے؟ اور پھر جہاں ایک لیڈر کا پسینہ گرتا ہے۔ وہاں ایک سو رخصتا کاروں کا لہو نہیں بہتا ہے؟ جب تک ریوے انجن بنتا ہے تو کیا لوہے کو گھیلانے سے لے کر لوہے پر رنگ کرنے تک تمام سائنسی عملے حرکت میں نہیں آتے؟ جب ایک افسانہ لکھا ہے تو حروف ابجد سے لے کر ان تمام نرم و نازک خیالات کے تانے بانے سامنے نہیں ہوتے۔ جن کے رنگین نقوش ان سیکڑوں بلکہ ہزاروں مصنفین کے ہوقلم نے اگلے ہیں کہ جن کے نام سے بھی کوئی آگاہ نہیں؟ جب ایک نیا فلسفہ مرتب کیا جاتا ہے تو اس کی ترتیب و قواعد میں ان گنت جزئیات اور کڑیاں نہیں ہوتیں جو ایک بہین سیکڑوں فلسفیوں نے شب و روز کی جانکاه کاوشوں کے بعد تعمیر کی ہیں؟

پھر ان تمام چیزوں کا خالق ایک آدمی کیسے ہو سکتا ہے۔ اور خاص طور پر وہ "بڑا آدمی" جو اپنے آپ کو یوں منتشر کرتا پھرتا ہے۔ کہ میں خالق ہوں اس فلسفے کا، اس ادب کا، اس سائنس کا، اس ایجاد کا، میں شیر ہوں! میں بڑا آدمی ہوں! کیوں ہم اس آدمی کی پرستش کریں۔ اسے جوتے کیوں نہ لگائیں؟

اگر آپ کسی عام آدمی، کسی انگریز، جرمن، ہندوستانی، فرانسیسی، چینی، امریکن، حبشی، کسی ملک یا کسی قوم کے ایک آدمی سے بات کریں۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ ایک عام آدمی ہو۔ بڑا آدمی نہ ہو تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ وہ کتنا اچھا آدمی ہے۔ اس کا دل ہر دم محبت کا سرچشمہ ہے۔ وہ اپنے ہمسایوں سے محبت کرتا ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا کہ اسے اس کے گھر میں اس کے چھوٹے سے بانیعے میں اس کے کھیتوں میں کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ وہ اپنے دوستوں اور اپنے کام کرنے والے ساتھیوں کے درمیان ہنستے کھیلتے اپنی زندگی بسر کرنی چاہتا ہے۔ وہ بڑا انسان نہیں ہے کیونکہ وہ بڑا انسان نہیں۔ وہ دوسروں کے حقوق غضب کرنا نہیں چاہتا۔ دوسروں کی آزادی چھیننا نہیں چاہتا۔ صرف اپنے حقوق، اپنی آزادی چاہتا ہے، یہ فتنہ تو صرف بڑے آدمیوں اور ان کی جماعتوں نے جگا رکھا ہے۔ یہ لوگ اقلیت میں ہیں اور انسانوں کے حقوق پر چھاپہ مارے بیٹھے ہیں۔ جب تک یہ لوگ موجود رہیں گے۔ نہیں کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔ اور ہر بیسویں سال نئی انسانی نسل کو ذبح کرتے رہیں گے۔ ان سے کسی بہتری کی توقع ہی نہیں کی جا

سکتی۔ ہماری ترقی بڑے آدمیوں کی حد سے بڑھی ہوئی خود پرستی، ہوس اور  
 پندار جاہ و چشم سے نہ ہوگی۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی مشترکہ مساعی  
 سے ہوگی۔ نئی دنیا بڑے آدمیوں کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اچھے آدمیوں  
 کی ضرورت ہے!

دیکھئے، دیکھئے۔ وہ رہا ایک "بڑا آدمی"۔۔۔ شیر آیا، شیر آیا،  
 دوڑنا۔۔۔!



## ردی

### تعریف

یہ غلط ہے کہ ہر بی اور ذیل شے کو ردی کہتے ہیں۔ دراصل ردی صرف اسی شے کو کہا جاتا ہے جو ردی ہو اور یہی ردی کی تعریف ہے۔

### مثال

یہ مضمون کیسا ہے؟ ردی!

یہ افسانہ نگار کیسا ہے؟ ردی! (موزن مرجا بروقت بولا۔ تری آواز)

ردی!

یہ ڈاکٹر کیسا ہے؟ ردی!



کسی زمانے میں گرم پانی بھرا جاتا تھا۔ رکھی رہتی ہیں یا پنساری کی وہ دکان جہاں ہلدی کے اینار مونٹ ایورسٹ کی چوٹی کی طرح بلند ہوتے اور دار چینی یا قہوہ کی طرح اور نمک پسپا ہوا پکنا۔ ردی کے ساتھ ہمیشہ ردی چیزوں کا خیال آتا تھا۔ دراصل یہ ردی کی خاصیت ہے۔ اس کا کیمیائی عمل یہ ہے کہ جس چیز کو چھوتی ہے۔ اسے بھی ردی بنا دیتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک طرح کا پارکس پتھر ہے۔ میں نے ہزار بار کوشش کی۔ لیکن ردی دیکھ کر یا ردی کا خیال کر سکتے ہوئے بھی میرے ذہن میں کبھی بے خوش رنگ، لب لعلین، سنبل در سجان، چشم آہو کی یاد تازہ نہیں ہوتی۔ اگر یاد آئی بھی تو باسی پکوڑیوں کی بسترے بے شامی کباہوں کی، یا اس پرانے جوتے کی جسے میں موچی کے پاس کئی بار مرمت کرا نے لے جاتا ہوں۔ اس پر میری یہ بہت کہ ردی کی تعریف پر مضمون لکھ رہا ہوں۔ میری جرأت کی داد دیجئے۔ فرما دو کہ کوئی بھی اس کے مقابلے میں چیلنج ہے یعنی بالکل ردی ہے !

دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے نہ صرف ردی مضمون لکھنے والوں یا ردی پر مضمون لکھنے والوں کی حالت غیر تھی۔ بلکہ ردی کے متعلق کسی قسم کی تجارت کر کے والوں کا حال پتلا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں جب ہر چھینے کی پندرہویں تاریخ کو جیب ٹوٹا اور جیب میں سگریٹ کے بھی پیسے نہ پاتا تو ناچار ردی کا رخ کرتا۔ اس وقت منوں ردی بیچ کر بھی سگریٹ کے پیسے حاصل نہ ہوتے تھے۔ بہت ہوا تو ایک پکیٹ خرید لیا کہ نڈر کا، اس شان سے کہ حاتم طائی کی قبر پر گویا لات مار دی۔ میرا مطلب ہے کہ ردی امار دی اور اگر ردی بیوی کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ ننھے کے لئے جھمننا خرید لیتی تھی۔ اور ایک بار تو شاید ریشم کی سہلم گڑ یا ردی کے عوض میں ملی تھی لیکن

اگر دیکھا جائے تو جھٹھنے اور ربڑ کی گرڈ یا سے دل کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے ردی کی تجارت میں کوئی خاص نفع نہ تھا۔ ردی بیچنے والوں کا بازار الگ تھا۔ وہاں اکثر چوہوں کی بہتات رہتی۔ انہیں کوئی عزت کی نگاہ سے نہ دیکھتا تھا۔ میرا مطلب ردی بیچنے والوں سے ہے چوہوں سے نہیں۔ کپاڑے اور میونسپل کلیٹی کی کوڑا کرکٹ کی لاری کا ڈرائیور اور گلی گلی ردی بیچنے والے تو خیر بُرے تھے۔ لیکن ہم لوگ بھی جو کبھی کبھار ردی بیچتے تھے۔ بڑی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ مگر کم طرف خیس، ردی تک بیچ ڈالتا ہے۔ اور اس قسم کے القاب سے یاد کئے جاتے جنگ سے پہلے میں اگر یہی ردی پر مضمون لکھتا۔ تو ایڈیٹر فوراً اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا۔ جو عموماً ایڈیٹر کی میز کے نیچے اس کے قدموں میں رکھی ہوتی ہے کہ عورت اور ردی کا یہی ٹھکانہ ہے اور ردی پر جو مضمون ہو اس کا حشر بھی یہی ہونا چاہیے۔

لیکن یہ سب جنگ سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب صرف اچھے مضمون ردی کی ٹوکری میں پھینکے جاتے ہیں۔ اور ردی کی ٹوکری بھی میز کے نیچے نہیں بلکہ میز کے اوپر ایڈیٹر کے سامنے رکھی رہتی ہے اور ردی کا ایک ایک پرزہ اس میں احتیاط سے گن کر ڈالا جاتا ہے۔ بینک کا یہ میز بھی لوگوں کو اس احتیاط سے نہیں گنتا۔ کہ جس احتیاط سے یہ ردی گنی جاتی ہے۔ خدا بارہ برس کے بعد ردی کی بھی سنتا ہے۔ بلکہ بیس برس ہی سمجھئے۔ کیوں کہ پچھلی جنگ عظیم غالباً ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی تھی۔ کچھ ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ حساب کر لیجئے۔ ہم نے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا تو کیا ردی پر ہی مضمون لکھتے۔

جنگ میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ چیزیں ہنگی ہو جاتی ہیں اور آدمی کستے ہو جاتے ہیں۔ چاہے یہ جنگ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہو یا جمہوریت کے خلاف یا فسطائیت کے خلاف یا جاگیرداروں کے خلاف۔ جنگ کا یہ ایک ایسا اقتصادی پہلو ہے۔ جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ امر اتنا ہی آسان اور بدیہی ہے جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں اور دو دو گیارہ ہوتے ہیں اور جنگ میں صرف ہند سے ہی نہیں بلکہ لوگ بھی تو دو گیارہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن خیر ہر جنگ میں یہ قربانی ناگزیر ہوتی ہے۔ اس قربانی کے بغیر ظلم کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

اسی لئے انسان کو ہنگامی بھی ایک حد تک گزارا ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک حد تک، اور جب ہنگامی اس حد سے تجاوز کر جائے تو بڑی مضحکہ خیز بات بن جاتی ہے عموماً اس مضحک صورت کو جنگی مزاح کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مضحک صورت یہ ہے کہ آدمی سترہ روپے میں بکتا ہے اور جوتا اٹھارہ روپے میں اور ایک اچھا جوتا اڑتالیس روپے میں۔ پہلے اڑتالیس روپے میں ایک بھینس آتی تھی اب اتنے ردپول میں تین آدمی بکتے ہیں۔

کوئلہ لیمے کوئلے کا بھاؤ جو بڑھنے لگا تو گیہوں کے برابر ہو گیا۔ بازار جائے تو کوئلہ بھی اسی بھاؤ میں مبتلا ہے۔ جس بھاؤ گیہوں۔ اب چاہے کوئلہ کھائے چاہے گیہوں۔ چاہے گیہوں چلائے چاہے کوئلہ۔ پھر کوئلے کا بھاؤ جو بڑھنا شروع ہوا۔ تو گندم سے دگنا ہو گیا۔ یعنی اب اشرفیاں کیٹیں اور کوئلوں پر مہر میں زیادہ فائدہ نظر آنے لگا۔ اور لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ کوئلوں کی بجائے گیہوں چلائیں، پھر جب گیہوں بھی نہ ملا تو وہ اپنا جی چلائے گئے اور جب بالکل ہی جی



جان سے گزر گئے۔ تو گئے دلوں جہاں نظر سے گزر رہی تیری صورت کا کوئی بشر نہ ملا  
پڑھنے لگے۔

یہی حال تاجنہ کا ہوا۔ یعنی جب تاجنہ کا بھاؤ بڑھنے لگا تو اس قدر بڑھا  
کہ بازار میں بیسہ تک دیکھنا مشکل ہو گیا۔ بھاؤ اس قدر بڑھا کہ چاندی سے بھی بڑھ  
گیا۔ پھر کیا تھا لوگوں نے بینکوں سے اپنی چاندی کے زیور نکلوا لئے اور ان کی جگہ  
تاجنہ کے برتن رکھ دیئے۔ پھر روٹی کا بھاؤ جو بڑھنا شروع ہوا تو سونے  
کے بھاؤ بھی بڑھ گئے۔ یس نے اسی دم اپنی بیوی کے سونے کے زیور  
بیچ دیئے۔ اور اپنے گھر کے تو خشک اور لحاف بینک میں محفوظ کرادیئے  
کون جانے بھی کس دم کیا ہوتا ہے۔ میاں یہ جنگ ہے۔ اپنا مال بینک میں محفوظ  
کرادو۔ ہاں!

اور پھر کاغذ، ہاں صاحب کاغذ بھی دون کی لینے لگا۔ یہ ذلیل چھیڑا جو ہانس  
کے ریشوں اور میلے کچیلے کپڑوں سے بنتا ہے۔ یہ بھی صاحب کی باتاؤں، آسمان  
سے باتیں کرنے لگا۔ اس کا بھاؤ جو اوپر چڑھنا شروع ہوا تو کوئلے اور گیہوں کے  
بھاؤ سے بھی بڑھ گیا۔ مجھے وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے۔ ان دنوں رسالوں کے مالک  
اور ناشر لوگ بہت پریشان تھے۔ فریدار رسالے اور کتابیں مانگتے تھے اور ناشر  
کتا تھا کہ دو سیر گیہوں لے لو۔ تین سیر کوئلے لے لو لیکن رسالہ یا کتاب طلب نہ  
کرو۔ مضمون نگار اپنا مضمون حفظ کر کے ایڈیٹر کو سناتا تھا۔ اور اگر وہ ایڈیٹر کو  
پسند ہوتا تو وہ مضمون۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ مضمون نگار کو کاتب کے حوالے  
کر دیتا۔ اور مضمون نگار پھر کاتب کو اپنا مضمون سناتا۔ تب جا کر کاتب کتابت

م شروع کرتا۔ اور بعد میں جب کاغذ اور بھی گراں ہو گیا۔ تو کاتب کو بھی مضمون حفظ کرنا پڑتا اور وہ لیتھو کے پریس میں جا کر حرف کنندہ کرتا اور اس طرح کہیں جا کر پچھتا۔

لیکن کاغذ کی گرانی اور بھی بڑھتی گئی اور پھر کاغذ کی قیمت کپڑے سے بھی بڑھنے لگی۔ ان دنوں میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندو مسلم کی مناسبت سے ہندو اخبار اپنے خریداروں کو اخبار کی بجائے ایک دعوتی دیا کریں اور مسلمان اخبار لٹھے کی شلوار، اور جوادی پچھے ہوں وہ کاغذ کی بجائے کپڑے پر چھپیں۔ کپڑے ہی کی مضبوط جلد ہو اور کپڑے ہی کے ورق، پاپلین کے ورق، یا لٹھے کے ورق، یا سپید ریشم کے ورق اور رنگین چھینٹوں پر سہ رنگی تصاویر شائع ہوں۔ اعلانات اس قسم کے ہوں۔

رسالہ ساتی پڑھنے کو نئے لٹھے پر شائع ہوتا ہے خالص پاپلین کی جلد ہے۔ جسے دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ ساتی بکلوہ دشمن ایمان اگہی :-

رسالہ ہمایوں ہر یکم تاریخ کو نہایت باقاعدگی سے چھبیس نمبر کی ممل پر شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے نے آج تک کبھی کھدرا استعمال نہیں کیا۔ دو روز زمانہ چال قیامت کی چل گیا

رسالہ ادب لطیف پڑھنے۔ ہندوستان کا واحد ترقی پسند ماہنامہ ہمیشہ بات کا بنا ہوا دوسو تو کپڑا استعمال کرتا ہے۔ رسالہ ادب لطیف پڑھنے اور اپنے کت کے جولاہوں کی مدد کیجئے۔ مزدور

کسان زندہ باد!

پہلے پہل صرف سگریٹوں کے پکیٹ لوٹائے جاتے تھے۔ پھر کپڑوں پر چھپے ہوئے رسالے بھی لوٹائے جانے لگے۔ بصورت دیگر ناشر لوگ نئی کتابیں اور نئے رسالے دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان پرانے رسالوں کو لانڈری میں بھیج دیا جاتا۔ جہاں سے یہ رسالے دھلے دھلاکے واپس آجاتے اور پھر مطبع میں چھپ کر انہیں خریداروں کو بھیج دیئے جاتے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ ہر مطبع کے ملائے رسالے دھونے والی لانڈری بھی کھل گئی۔ آپ نے کئی جگہ اس قسم کا اشتہار پڑھا ہوگا۔

صفاحیٹ لانڈری

یہاں رسالہ ساتی دھویا جاتا ہے۔

عید نمبر، افسانہ نمبر اور سالانہ بھی ڈرائی کلین کئے جاتے ہیں۔

زمانہ رسالوں کو دھونے کا خاص انتظام ہے

صفاحیٹ لانڈری

سے

اپنا رسالہ، اپنی کتاب، اپنا اخبار دھلوائیے۔

اور اک

نیا اخبار، نیا رسالہ، نئی کتاب حاصل کیجئے۔

اللہ جو شوق دے تو کتابیں پڑھا کر اور

لیکن اب وہ زمانہ بھی قریباً بیت چکا ہے

اب اک نیا دور آیا ہے

ردی کی قیمت بڑھ رہی ہے۔

بازار سے اگر آپ ایلومینیم کا برتن خریدیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ ایک دیگچی خریدیں۔ تو چھ سو سات روپے میں مل جائے گی۔ لیکن یہی دیگچی اگر آپ توڑ پھوڑ کر دوسرے دن کباڑیوں کے پاس لے جائیں۔ تو وہ اس کے آپ کو اٹھ نو دس روپے تک دے دے گا۔ کیوں کہ ایلومینیم ایک قیمتی دھات ہے۔ سب دھاتوں میں یہی دھات ہے۔ اس لئے ہوائی جہازوں کی تعمیر میں کام آتی ہے۔ اور ایلومینیم اکٹھا کرنے کا اس کے سوا اور کیا طریقہ ہے کہ لوگوں سے ایلومینیم کبے کا۔ چیزیں مول ضرور لے لی جائیں۔ چنانچہ آج کل کئی لوگوں نے تجارت شروع کر رکھی ہے۔ وہ بازار سے نیا برتن لاتے ہیں اور پھر اسے توڑ پھوڑ کر سوائے یا ڈیوڑھے داموں کسی کباڑیے یا ایلومینیم اکٹھا کرنے والوں کے پاس بیچ دیتے ہیں۔

یہی حال ردی کا ہے۔

ردی اکٹھا کرنے اور ردی بیچنے والوں کے مزے ہیں۔

ردی کی قیمت اصل کاغذ سے دو گنا ہو گئی ہے۔

چنانچہ اگر آپ بازار سے ایک کتاب، کوئی ایک کتاب خرید لیجئے۔

پہلے میری کتاب ہی خرید لیجئے۔ آخر اس میں رکھا گیا ہے، اور پھر اس کتاب کو

خرید کر سیدھے کباڑیوں کے پاس لے جائیے۔ تو وہ اسے تول کر آپ کو

دام دے گا۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح سے جو قیمت آپ نے اس

کتاب کی ادا کی ہے۔ اس سے دُگنے دام آپ کو کبڑا بیٹے سے مل جاتے ہیں کیوں کہ ناشر تو ابھی تک کتاب تول کر نہیں دیتے۔ وہ تولوں ہی اسکل پچو کتاب کی قیمت لگا دیتے ہیں۔ اور کبڑا یا کتاب کا مضمون دیکھ کر نہیں کتاب کا وزن تول کر قیمت لگاتا ہے۔ چنانچہ آج کل کتاب لکھنے میں یا کتاب چھاپنے میں اتنا فائدہ نہیں جتنا کتاب کو ردی بنا کر بیچنے میں۔ اس سے ایک خاص فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ اب نفس مضمون یا سٹائل پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر دیکھا جائے تو باقاعدہ حروف لکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہی کافی ہے کہ آرڈی ترچی لکیریں کاغذ پر کھینچ دی جائیں اور کتاب کو پریس میں چھاپ لیا جائے اور پھر اسے فوراً کبڑا یے کے ہاں فروخت کر دیا جائے۔ میں سوچتا ہوں۔ اس طرح ایک کتاب کے ایک مہینے میں ایک نہیں درجنوں ایڈیشن نکل سکتے ہیں اور فوراً کبڑا یے کے پاس فروخت کئے جاسکتے ہیں۔ کیوں کہ کورا کاغذ آج کل ردی سے بہت سستا ہے۔

فرا اندازہ لگائیے کہ میں دفتر سے ۵، روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ دس پندرہ روپے پندرہ بیس مضمون لکھ کر بیسے میں کما لیتا ہوں۔ پھر ایک درجن کتابوں کی چھ روپے رانٹ بھی آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جنگ کی وجہ سے ہنگامی اس قدر زیادہ ہے کہ اگر میں ردی نہ بیچوں تو گھر کا خرچ کبھی پورا نہ کر سکتوں۔

چنانچہ ہر ماہ جو رسا لے، اخبار اور کتابیں میرے پاس آتی ہیں صرف انہیں کبڑا یے کے حوالے کر کے میں ایک سو، سو اسو روپیہ کما لیتا ہوں۔ اب سوچتا



ہوں۔ یہ تو بہت ہی نفع بخش تجارت ہے اور اگر ردی کی قیمت اس طرح بڑھتی  
گئی تو وہ دن دور نہیں۔ جب مصنف کو اپنا مسودہ ناشر کی بجائے ردی والے  
کے پاس فروخت کرنے میں زیادہ فائدہ ہو گا۔ کیوں کہ ردی والا نفس مضمون نہیں  
دیکھتا۔ وزن دیکھتا ہے!

## ریاستِ اسلامیہ

ہم نے یہ کتاب لکھ کر اس کی شہرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم نے اس کی شہرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم نے اس کی شہرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم نے اس کی شہرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم نے اس کی شہرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم نے اس کی شہرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم نے اس کی شہرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم نے اس کی شہرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم نے اس کی شہرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم نے اس کی شہرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم نے اس کی شہرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

## میرے دوست کا بیٹا

تین سال کی خاموشی کے بعد میرے دوست نے مجھے خط لکھا تھا تمہاری کہانیوں کو پڑھتے پڑھتے اب تم سے مایوسی ہو چلی ہے۔ تم ایک بہت بڑے ادیب بن سکتے تھے لیکن آخر میں ایک بہت بڑے پمفلٹ باز بن کے رہ گئے۔ تمہاری کہانیوں میں پڑ پگندے اور خطابت اور بے کار کی لکچر بازی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تمہاری کہانیوں کا انجام پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اب ان میں وہ مزہ نہیں رہا۔۔۔۔۔

لہذا چوڑا خط تھا پُرانی باتیں، نئے شکوے، میرے دوست نے جس اونچے کچے پر بیٹھ کے مجھے خط لکھا تھا وہ اسے زریب بھی دیتا تھا۔ وہ بہت امیر آدمی تھا اور لاکھوں روپے کا بلیک مارکیٹ کا دھڑا کرتا تھا۔ روٹی چاول، سیمٹ، ٹوہا، کاغذ موٹر، کار بائیڈ، لپ اسٹک کس چیز میں اس نے بلیک مارکیٹ نہیں کیا تھا وہ جس سے کوہا تھ لگانا تھا وہ بازار سے غائب ہو جاتی تھی اور پھر چوری چھپے سونے

کے بھاؤ بکتی تھی۔ میرا دوست کبھی پکڑا نہیں گیا۔ کیونکہ وہ پکڑنے والوں کو چندہ دے کر خوش رکھتا تھا۔ یعنی لگے ہاتھوں اس نے اُن کی دیانت داری اور دیش بھگتی کو بھی کلمے بازار میں بیچ دیا تھا۔ میرا دوست بڑا چالاک تھا۔ کائیاں، لیکن ایک بہت بڑی خوبی اس میں تھی وہ ادب کا بھی قدر دان تھا۔ شاعری کا عاشق اور کہانیوں اور ناولوں کا دلدادہ، اس کے پاس ادب کی ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔ وہ ادیبوں کا پرستار تھا اور اکثر ان کی خاطر تواضع کر کے بہت خوشی محسوس کرتا تھا۔ اُس نے جب اس کا یہ خط میرے پاس آیا تو میں بہت ادا اس ہو گیا۔ ہر لکھنے والے کو اپنا ادب عزیز ہوتا ہے۔ وہ تعریف سے خوش ہوتا ہے۔ اور اپنی بڑائی سن کر رنجیدہ ہوتا ہے۔ یعنی اس معاملے میں وہ بالکل دوسرے انسانوں کی طرح ہے جو اپنی محنت کی تلاش اور اس کا صلہ چاہتے ہیں۔

خط ساڑھے چار بجے کی ڈاک سے آیا تھا۔ میں نے اُسے ایک بار پڑھا، دوسری بار پڑھا، تیسری بار پڑھا اور پڑھ کر اپنی تیلوں کی جیب میں ڈال لیا۔ اور گھر سے باہر چل قدمی کے لئے نکل گیا سر جھکائے ہوئے متفکر اور طول چلتے چلتے یکایک میرے دل میں اپنے دوست کی محبوبہ کا خیال آیا۔ جب میرا دوست بیٹی میں تھا تو اس نے ایک محبوبہ پالی تھی۔ جیسے لوگ طوطا یا بندیا پالتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پہلے ہی سے ایک گرمی ہوئی اُدبش مزاج لڑکی تھی۔ اور ایک سچے سچے گھر میں رہتی تھی جہاں دو نوکر تھے۔ صوفہ سیٹ تھی۔ آرام کرسیاں تھیں ریڈیو تھا اور ایک خاں صاحب تھے جو اس کے گھر بار کا سارا خرچ پورا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کا نام گل بانو رکھ چھوڑا تھا اس سے پہلے اس کا نام کچھ اور

تھا اور جب میرے دوست نے اُسے پالا تو اس نے اس کا نام رام پیاری رکھ دیا۔ رام پیاری بڑی بھولی لڑکی تھی وہ گہری ہونی عورت ہونے کے بھی اپنے مرد سے محبت کی خواہاں تھی۔ خاں صاحب نے اسے روپیہ دیا۔ لیکن محبت بالکل نہیں دی۔ بے چارے شریف آدمی تھے۔ جو چیز ان کے پاس نہیں تھی، کہاں سے دیتے محبت تو میرے دوست کے پاس بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ ایک مدت سے کالے بازار کا دھند کرتا تھا، لہذا وہ محبت بھی اسی ڈھنگ کی لے آیا۔ اور گل باتو یعنی رام پیاری کو لاسے پر لگا لیا اور اُسے ایسا جھانسا دیا کہ وہ اپنا کاروبار سب بھول کے اسی کی محبت کے گیت گانے لگی۔ اسی دوران میں رام پیاری کے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جو بالکل اپنے باپ کی بھوری آنکھیں، سنہری بال، اور موٹے ہونٹ لے ہوئے تھا۔ میرے دوست کو اپنے بیٹے سے بڑی محبت تھی مگر رام پیاری کے جسم میں اس بچے کے بعد میرے دوست کے لئے وہ کشش اور جاذبیت نہ رہی اور کچھ یہ بات تھی کہ ان دنوں وہ دلی میں شکر کی ایک بہت بڑی بل کھڑی کرنے کی اسکیم سوچ رہا تھا۔ چنانچہ بچے کی پہلی سالگرہ کے چند مہینوں کے بعد وہ ایک دن اچانک بمبئی سے رخصت ہو گیا اور اس نے رام پیاری یا مجھے یا اپنے اور کسی عزیز دوست کو بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ ایسے غائب ہوا جیسے کنٹرول ہوتے ہی کوئی شے بازار سے غائب ہو جاتی ہے۔ اب تین سال بعد اس کا یہ خط آیا تھا اور یکایک میرے دل میں اس کی محبوبہ کا خیال آیا اور معا میں نے سوچا کہ کیوں نہ چل کے اس بے چاری کی خیروں جاننے کس حال میں ہوگی۔

بہی سوچتا سوچتا میں لوکل ٹرین سے باندھے پہنچ گیا۔ اور رام پیاری کے

مکان کی طرف چلا۔ اس وقت چھونچ چکے تھے۔ اور برگانہ الین کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ اس لین کے آخری سرے پر وہ مکان تھا جس کی پہلی منزل میں رام پیاری رہتی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تو اندر سے اس کا پڑانا نوکر نکلیں جھپکاتا ہوا باہر نکلا۔ مجھے پہچان کر مسکرانے لگا۔

بولاً: "سیٹھ بھی آئے ہیں؟"

میں نے کہا: "نہیں۔ خالی میں ہی آیا ہوں۔"

"آئیے۔ آئیے۔ وہ دروازہ اچھی طرح سے کھولتے ہوئے اور خود ایک طرف ہو کے بولاً: "اندر چلے آئیے۔"

میں نے اندر آ کے پوچھا: "بائی جی کہاں ہیں؟"

"وہ تو پاسر گئی ہیں۔ نوکر حیرت سے میری طرف دیکھتے لگا۔ گویا کہہ رہا ہو کیا آپ کو معلوم نہیں کہ وہ ہر روز شام کو اس وقت گھر سے باہر چلی جاتی ہیں۔ اور صبح سویرے لوٹ کر آتی ہیں۔ جب آپ سیٹھ صاحب کے ساتھ کبھی کبھار شریف لاتے تھے۔ اس وقت بھی آپ کو ہماری بائی جی کا یہ اصول معلوم تھا پھر آپ اس وقت یہ لائینی گفتگو کیوں فرما رہے ہیں۔"

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہی کمرہ تھا، وہی صوفے، مٹھان، ریڈیو، گراموفون۔

ٹہنی پرچے، اور خاکدان میں آدمے جلے ہوئے سگریٹ، ڈرائنگ روم سے خوابگاہ بھی کھالی رہے رہی تھی۔ بستر کے اوپر میلے رنگ کا گاؤن پڑا تھا اور مسہری سے ایک ریشمی شلوار تک رہی تھی اور اس کا ازار بتد دونوں جہان محبت میں ہمارے وہ جارہا تھا نیچے بستر کی طرف، جس کے قریب ایک کاٹھ کا گھوڑا تھا۔ غالباً نیچے کا ہو گا۔



میں نے نگاہ پھیر کر تو کر کی طرف دیکھا۔ کہو رام بھروسے کیسے ہوتا ہے۔ وہ جلدی سے ادھر ادھر دیکھ کے بولا صاحب میرا نام اب رام بھروسے نہیں ہے۔ جان ہے۔

جان؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔ اور باقی جی بھی اب رام پیاری نہیں رہی وہ مس صوفیا کہلاتی ہیں۔ کیا بات ہے؟“

جان کے غلیظ دانت باہر نکل آئے۔ ہنس کر بولا سیٹھ جو اس مکان کا مالک ہے نا۔ وہ کرسمپن ہے، سیٹھ بد گانزا۔ یہ ساری کی ساری عین اُسی کی ہے۔ بڑا امیر آدمی ہے۔

”ادہ میں نے تھوک حلق کے اندر لگتے ہوئے کہا اور مجھے خیال آیا کہ کبھی ہماری سڑک جہاں ہمارا مکان ہے اس کا نام بھی اکبر روڈ تھا اور پھر جان میکم روڈ ہو گیا۔ آج کل چھوٹی لال چوٹنگی لال روڈ ہے۔ جب مالک بدل جاتے ہیں تو ملکیت کا نام بھی بدل جاتا ہے۔ غلامی اسی طرح رہتی ہے۔

جان نے پوچھا: آپ چائے پیئیں گے؟

”نہیں“ میں نے جواب دیا۔

”کوئی ٹھنڈا دندا“

”نہیں۔“

”نہیں پڈنگ کھلاؤ۔ یہ ایک چھوٹا سا لڑکا بول رہا تھا۔ عمر مشکل سے چار سال کی ہوگی۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہی سنہرے بال، فراخ ماتھا، بھوسے

آنکھیں اور موٹے ہونٹ، میرے دوست کا بیٹا۔ خاکی نکر اور گلابی قمیض پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اسے اپنی گود میں اٹھایا اور پیار کرتے لگا۔

لڑکے نے کہا: کیا تم نمی کے دوست ہو؟

میں نے رگ کے کہا: ہاں اور کہتا بھی کیا۔

لڑکے نے کہا: "نمی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ رات کو بھی گھر پر نہیں ہوتیں۔"

"کہاں جاتی ہیں؟" میں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

لڑکے نے ذرا تکتے ہوئے کہا: "کا۔ کام پر جاتی ہیں۔ صبح کو آتی ہیں۔" پھر

ذرا توقف کرنے کے بعد بولا: "تصویر دیکھو گے؟"

"ضرور دیکھیں گے؟"

لڑکا میری گود سے اندر خواب گاہ میں گیا اور وہاں *TIMES OF INDIA*

کا سالانہ نمبر اٹھا لایا اور پھر آکے میری گود میں بیٹھ گیا۔ پھر یکایک کچھ سوچ کے فوراً

میری گود سے اتر گیا۔ اور گجرا کے بولا: "سگریٹ پیتے ہو؟"

میں نے کہا: "ہیں؟"

وہ بولا: "میری نمی تو پیتی ہیں۔ یہاں تو سب پیتے ہیں۔ تم کیوں نہیں پیتے ہو؟"

میں نے پوچھا: "کیا تمہاری نمی سگریٹ پیتی ہیں؟"

وہ بولا: "ہاں سگریٹ پیتی ہیں۔ تم کو وہ ڈبہ دکھاؤں؟" وہ پھر گود سے اتر

کر اندر جانے لگا میں نے روک کر کہا: "نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" وہ تصویریں

دیکھیں۔ بچہ درق اُٹھنے لگا بڑے بڑے رنگین خوبصورت اشتہار تھے پہلا اشتہار

گھڑیوں کا تھا۔

بچے نے کہا: یہ گھڑیاں ہیں۔ سب اچھی اچھی گھڑیاں ہیں۔ تمہیں کون سی پسند ہے؟ میں نے ایک چھوٹی گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہ بچہ بولا: واہ یہ تو عورتوں کی گھڑی ہے۔ مردوں کی گھڑی تو یہ ہوتی ہے۔ یہ بڑی والی۔ اچھا ہم تم کو یہی لے دیں گے۔

بچہ اٹنا کہہ کر ہنسنے لگا۔

اگلے ورق پر پانڈ کی اسنو کا اشتہار تھا۔

بچہ نے کہا: میری مٹی سے لگاتی ہے۔ یہ بھی لگاتی ہے۔ تم میری مٹی کو یہ کریم لاکے دینا اور یہ عطر کی خوشبو بھی اور ایسا ہونٹوں کو لگاتے والا بھی۔۔۔ لا دیں گے۔

ورق اُلٹا گیا۔

یہاں پر کاغذ کا اشتہار تھا۔ کینڈین کاغذ کا اشتہار۔ یہاں پر ایک گھنے جنگل کی تصویر تھی جس میں تناور درخت کھڑے تھے۔

میں نے لڑکے پوچھا: یہ کیا ہے؟

وہ بولا: یہ جنگل ہے نا۔ اس میں ٹارزن رہتا ہے۔ ٹارزن منہ پر ہاتھ رکھ کر یوں چیتا ہے جیسے بلی۔ ہا ہا ہا ٹارزن کو میں نے باندھ سینا میں دیکھا تھا۔ مجھ کو انکل کے ساتھ لے گئی تھی۔

انکل کون ہے؟

واہ تم انکل کو نہیں جانتے۔ انکل کی بڑی بڑی موٹھیں ہیں۔ لال لال آنکھیں ہیں۔ مجھے اس سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ ایک روز رات کو انکل ہمارے گھر پر سورا



میں نے ورق الٹا۔ یہ تو مٹن پن کی تصویر تھی۔ دو فوٹن پن تھے۔ ایک کی نب پتلی دکھائی گئی تھی۔ دوسرے کی نب موٹی تھی۔

لڑکے نے پوچھا: تمہیں کون سا قلم اچھا لگتا ہے؟

میں نے کہا: موٹی نب والا۔

”وہ کیوں؟“

”موٹی نب والا صاف ستھرا لکھتا ہے۔“

”اوہوں۔ چھوٹی نب والا بہت زیادہ لکھتا ہے۔ چھوٹی نب والا پن لیتا سمجھے؟“

”سمجھ گیا؟“

”تو آگے چلو۔“

آگے ایک مضمون تھا فوجیوں کے متعلق، ایک تصویر میں ایک سپاہی وری

پہنے، ڈھول بجا رہا تھا۔

”یہ کون ہے؟ میں نے پوچھا۔“

لڑکے نے جواب دیا: یہ میں ہوں ڈھول بجا رہا ہوں؟ دوسرے صفحے پر ایک

آدمی پاتلی کی بالٹی بھر کے آرہا تھا۔ لڑکے نے کہا: یہ ہمارا نوکر ہے۔ پھر اس نے

جلدی سے ایک اور ورق الٹ دیا۔ یہاں پر وہسکی کا اشتہار تھا۔

لڑکے نے چلا کے کہا: ابا۔ برانڈی۔ یہ برانڈی کی بوتل ہے۔ میری می برانڈی

بھی پیتی ہیں؟ اس نے بڑے فخر سے سر اٹھا کے کہا اور پھر مجھ سے پوچھا: تم بھی

پیتے ہو۔ تولادوں، دہاں پلنگ کے نیچے رکھی ہے۔

میں نے کہا: نہیں۔ مجھے برانڈی اچھی نہیں لگتی کڑوی ہوتی ہے نا؟



لڑکے نے بڑے افسردہ انداز میں سر ہلا کر کہا: کڑوی چیزیں مجھے بھی اچھی نہیں لگتیں۔ یہ دیکھو میرے پیر میں زخم ہے؟  
 لڑکے نے اپنا زخم دکھایا۔ جس پر ٹن پکڑا یو ڈین لگی ہوئی تھی۔  
 لڑکے نے کہا: اس زخم میں بڑا درد ہوتا ہے لیکن مٹی اس پر ہمیشہ کڑوی دوائی لگاتی ہیں۔

کڑوی دوائی بڑی میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔ وہ بولا: مٹی ہمیشہ کڑوی دوائی لگاتی ہیں اس سے مجھے بڑا درد ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کوئی میرے زخم پر میٹھی دوا لگا دے۔ شکر کی طرح میٹھی دوائی۔ میں نے کہا: میں تمہیں وہ دوائی لا دوں گا۔“

بچے نے اپنے دونوں نٹھے سے ہاتھ میری گردن پر ڈال دیے اور اپنے رخسار پر ہاتھ لگا کر کہنے لگا: ”کو میری گردن سے مس کر کے بولا۔“  
 ”ضرور لا دیتا۔ وعدہ کرو۔“

”وعدہ کرتا ہوں۔“  
 ”اچھا تو میں تمہیں ایک بہت اچھی چیز دکھاتا ہوں۔ آنکھیں بند کر لو۔“  
 ”میں نے آنکھیں بند کر لیں۔“

آنکھیں کھولنا نہیں درتے میں تمہیں مار ڈالوں گا۔ لڑکا خواب گاہ کے اندر جاتے ہوئے بولا پھر بلیک کے نیچے سے دو پٹاٹے چلانے والے پستول نکال لیا۔  
 اب وہ دونوں پستول میرے سامنے تلے کھڑا تھا۔  
 پٹاخ پٹاخ! بچہ پستولوں کو چلاتے ہوئے زور سے چیخا۔ پھر اس نے پستولوں

کو اپنی نیکر کی جلیوں میں ڈال لیا اور مجھے فوجی سلام کیا۔

میں نے اُسے سلام کیا ؟

وہ بولا : کبوتر دیکھو گے ؟

میں نے کہا : کہاں ہیں کبوتر ؟

وہ بولا : سو رہے ہیں اُدھر کبوتر خانے میں۔ مٹی تو رات کو جاگتی ہیں اور دن کو سوتی ہیں مگر میرے کبوتر دن کو جاگتے ہیں اور رات کو سوتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب ہے اور ایک میم صاحب ہے :

میں نے کہا : میم صاحب کون سا کبوتر ہے ؟

”وہ سینہ پھلا کے یوں چلتا ہے۔ وہ میم صاحب ہے ایک دن اس کی دم سے بہت سارے انڈے نکلے۔ پتلے پتلے چھوٹے چھوٹے انڈے“

”میں نے ایک انڈا پھوڑ دیا اپنے ماتھے سے۔ تو مٹی نے مجھے پیٹا۔ مٹی جب بہت برا نڈی پی جاتی ہیں تو مجھے اکثر پیٹتی ہیں۔ یہ زخم پاؤں میں جو ہے نا۔ یہ ایسے ہی ہوا تھا۔ مگر مٹی مجھ کو پیٹنے کے بعد ہیار کرتی ہیں۔ چاکلیٹ کھاتے کو دیتی ہیں۔ مگر ایک دفعہ مٹی نے مجھ کو بہت پیٹا تھا۔ مگر وہ دوسری بات تھی :

”کیا بات تھی ؟“

وہ بولا ”کسی سے کہو گے تو نہیں ؟“

”نہیں“

وہ بولا میں گلی میں رہتا تھا۔ وہ جو دھوئی کارٹ کا ہے نا جو ننگا رہتا ہے اور کالا

سا ہے :

ہاں! ہاں! میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے اس کی تیشے کی گولی چھین لی۔ وہ مجھے کہنے لگا۔ گولی دے دو۔ میں نے نہیں دی۔ وہ کہنے لگا تو زندگی کا بیٹا ہے۔ تو زندگی کا بیٹا ہے۔ میں نے جیب بھی نہیں دی۔ تو اس کی ماں نے مجھے ایک چاٹا مارا اور وہ گولی مجھ سے چھین لی اور بولی۔ چلا جا۔ یہاں سے۔ زندگی کا بیٹا۔ میں روتا ہوا گھر آیا تو می نے مجھے بہت مارا اور مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ زندگی کا بیٹا کون ہوتا ہے تم جانتے ہو زندگی کسے کہتے ہیں؟

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ میری زبان پر جیسے تارے پڑ گئے تھے۔ بچے کے قراخ ماتھے پر پریشانی چھلکنے لگی۔ اس کے موٹے ہونٹ نیچے لٹک گئے۔ جیسے وہ ٹمنہ بسور رہا ہو۔ آہستہ سے بولا میری می تو اچھی ہیں۔ وہ زندگی نہیں ہو سکتیں۔ میرے پاؤں زندگی ہو گئے۔ وہ تو کبھی ہمارے گھر نہیں آئے۔ ضرور وہ زندگی ہوں گے۔ میری می بولتی تھی وہ کبھی گھر نہیں آئیں گے کیوں نہیں آئیں گے؟ اس نے میری طرف نگاہ پھیر کے پوچھا۔

میں نے جلدی سے نگاہ ہٹالی اور ٹائمر آف انڈیا کے ورق اٹھنے لگا۔ ورق اٹھنے اٹھنے لگا ہوں گا اشتہار سامنے آیا۔ ایک خوبصورت بچہ ہنس رہا تھا۔ لڑکے نے اسے دیکھ کر کہا: میں چھک سے اس کا گلا کاٹ ڈالوں گا۔ وہ کیوں؟

بس کاٹ ڈالوں گا؟

میں نے پھر پوچھا: وہ کیوں؟

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ میری طرف دیکھ کر ہنستا کیوں ہے؟ لڑکے تے آہستہ سے نفرت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کے کہا: یہ ہمیشہ میری طرف دیکھ کر ہنستا ہے؟ چھک چھک لڑکے نے ایک دم چاقو سے تصویر کو دو تین جگہوں سے کاٹ ڈالا ہنستے ہوئے بچے کی تصویر جگہ جگہ سے پھٹ گئی۔

میں نے بچے کو گود سے نیچے اتار دیا اور کرسمس منبر کو بند کر کے میز پر رکھ دیا۔ لڑکے کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ اور وہ حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے نوکر کو آواز دے کر کہا: ”رام بھروسے۔۔۔ او۔۔۔ جان۔۔۔ جان۔۔۔ جی سرکار۔“

”میں جاتا ہوں بھی؟“

”اچھا جی۔ تو۔۔۔ تو بائی جی سے کیا کہوں؟“

یہ ایک میرے ذہن میں فیض کے دو مصرعے برق کی طرح گونڈ گئے۔

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

”میں نے آہستہ سے کہا۔ کیا کہو گے۔ کہہ دینا کوئی نہیں آیا تھا۔“

میں نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا جو ابھی تک چاقو لے کر اٹھا۔

لڑکے نے چاقو زمین پر پھینک دیا اور صوفے سے لگ کر سسکیاں لینے لگا۔

”مہی۔۔۔ مہی۔۔۔ میں مہی کے پاس جاؤں گا۔“

میرے دوست! کیا میں تمہاری رنگین راتوں کی دل نواز کہانی لکھوں۔ یا اس

بچے کی کہانی جس کے گلے میں آج، ہی سے پھانسی کا پھندا دیکھ رہا ہوں۔ جو اس وقت بھی چاقو اٹھ میں لئے گلیوں کے خوبصورت بچوں کا گلا کاٹ رہا ہے ؟  
میرے دوست ! میں جانتا ہوں کہ میری کہانی میں وہ مزہ نہیں ہے جو شراب کے پیگ، امساک کی گولی، اور رتڈی کی ٹھمری میں ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں میں نے ابھی اپنی کہانی کو کالے بازار میں نہیں بیچا ہے۔ جہاں تم نے میرے وطن کی سیاست، شہیدوں کی عزت، اور بیٹیوں کی عصمت بیچ کے شکر کی بل کھڑی کی ہے۔

میں بھی اپنا فن بیچ کے تمہاری زندگی پر شکر کا قلات چڑھا سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرے سامنے تمہارا بیٹا ہے۔ اور میری کہانی اس کی نئی زندگی کے لئے لڑ رہی ہے۔



# ایک غائب

ایک سے بس شیو پوری سے گوالیار جا رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ شیو پوری کے مقام پر لوگوں نے منع بھی کیا تھا کہ شام کے وقت شیو پوری سے گوالیار جانے والی سڑک پر سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن بس میں جانے والے اکثر لوگ آج رات ہی گوالیار پہنچنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ڈرائیور کے ٹال مٹول کے بعد بھی اسے بس چلانے پر مجبور کر دیا۔ بس میں چوبیس آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ سب کے سب آج ہی گوالیار پہنچنا چاہتے تھے۔ اس بازار کے ایک ”دھابے“ سے کچھ کھاپی کے اور ادھر ادھر ٹھہل کر کچھ لوگوں سے گفتگو کرنے کے بعد وہ لوگ شیو پوری گوالیار کو رخصت ہو گئے۔

بس چور گاؤں سے ابھی آدھ میل دُور ہی تھی کہ راستے میں سڑک پر پتھروں کا ایک بڑا پتھر سڑک کو روکے ہوئے نظر آیا۔ سڑک کے دونوں طرف ڈاکو کھڑے تھے

مجبوراً ڈرائیور کو بس روکنی پڑی۔

بس رکتے ہی ہوا میں گولیوں کے فائر ہوئے اور پھر بس کو ڈاکوؤں نے ہر

طرف سے گھیر لیا۔

کلیان سنگھ ڈاکوئیں کے اندر داخل ہو کر کہنے لگا: تم میں سے آپرح برلا

کون ہے؟

ایک دہلا پتلا سانوے رنگ کا مارواڑی جس کے رشتی گرتے پر سونے کے ٹین کے

ہوئے تھے اور جو بے حد صاف شفاف دھوئی پہنے ہوئے تھا، کلیان سنگھ کی مشین

گن کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور کہتے ہوئے پیچھے میں بولا۔

”میں ہی آپرح برلا ہوں۔“

”تم اکیلے ہی ہو یا تمہارے ساتھی بھی ہیں؟“ کلیان سنگھ نے پوچھا۔

برلانے سیٹوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ پوری بس میری ہے۔ ہم سب لوگ گوالیار جا رہے ہیں۔“

”تم سب لوگ نیچے اترو۔“

”مگر۔۔۔“ آپرح برلانے احتجاج کرنے کی کوشش کی کہ کلیان سنگھ نے

مشین گن گھمائی۔ چند لمحوں میں سارے مسافر بس سے نیچے اتر گئے۔

کلیان سنگھ نے گولیاں مار مار کر بس کے سارے ڈائریکٹر پر کھڑے۔ پھر

ڈرائیور سے بولا۔

”تیری اور کلینر کی جان بخشی کرتا ہوں۔ لیکن تیری بس کا نمبر نوٹ کر لیا ہے۔

اگر تو نے کبھی پولیس کو خبر کرنے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہوگا!“ کلیان سنگھ کی

آواز میں ایسی گہری دھمکی تھی کہ ڈرائیور نے وہیں ہاتھ جوڑ دیئے۔

کلیان سنگھ کے ساتھ دس ڈاکو تھے۔ انہوں نے سارے قافلے کو ایک پہاڑی راستے پر چلنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ سب لوگ ڈرائیور اور کلینر کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

راستے بھر کلیان سنگھ نے اُن سے کوئی بات نہ کی۔ بس انہیں تیزی سے مختلف پہاڑی راستوں پر چلاتا رہا اور بھول بھلیوں میں گھماتا رہا۔ آخری ایک گھنٹے کا سفر بس کے مسافروں نے ڈاکو کے کہنے پر اپنی آنکھوں پر پٹی بندھوا کے کیا۔

رات کے کوئی آٹھ بجے کے قریب کلیان سنگھ اپنے دس ڈاکوؤں اور چوبیس مسافروں کے ساتھ اپنے اڈے پہنچا۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ آج کا ڈاکہ اُس کی زندگی کا سب سے بڑا ڈاکہ تھا۔ سب سے اہم! آج دوپہر ہی اُسے وارنٹس ڈائریکٹر سے شیو پوری سے اطلاع مل گئی تھی کہ سیٹھ گھنشیام داس برہلا کا ایک رشتہ دار سیٹھ اچرج برہلا اس بس سے سفر کر رہا ہے۔ کلیان سنگھ کو اس پر کوئی حیرت نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ جب سے اس علاقے میں ڈاکوؤں کی سرگرمیاں بڑھی تھیں، اکثر بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار بھی اپنی کاروں میں سفر کرتے کے بجائے عام معمولی آدمیوں کی طرح بس میں سفر کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکوؤں کو بھی اس حقیقت کا پتہ چل گیا تھا اور انہوں نے موٹروں سے زیادہ بسوں پر اپنی توجہ مبذول کر دی تھی۔

سیٹھ اچرج برہلا ہندوستان کے سب سے بڑے سرمایہ دار سیٹھ گھنشیام داس برہلا کا رشتہ دار تھا۔ اب وہ اس پارٹی کو انوار کر کے بہت آسانی سے

دس لاکھ روپے دھروائے گا۔ ایک ہی داؤ میں! — کلیان سنگھ آج بے حد خوش تھا۔

جو نہی ڈاکو اپنے اڈے پر پہنچے۔ کلیان سنگھ کی بیوی اور اس کی ساتھی پتلی اپنے غار سے باہر نکل آئی۔ اس کی گود میں ایک سال کا بچہ تھا۔ کلیان سنگھ نے اپنے بیٹے کا نام بہادر سنگھ رکھا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میرا بچہ بڑا ہو کر راجہ مان سنگھ سے بھی بڑا ڈاکو بنے گا اور اپنے باپ کا نام روشن کرے گا۔

پتلی نے نام پوچھا: ”کام بن گیا؟“ کلیان سنگھ خوشی سے اونچی آواز میں بولا: ”بہ لا ہی نہیں اس کے ساتھیوں کو بھی اٹھا لیا ہوں۔ بہ لا سے کم سے کم دس لاکھ لوں گا! اور باقی تیس مسافروں سے بلا جلا کر چار پانچ لاکھ اور ہو جائیں گے۔ ہندوستان کی سب سے امیر پارٹی کو گھیر کر لے آیا ہوں!“

کلیان سنگھ نے پتلی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا: ”اس کے بعد ہم سب لوگ ریٹائرڈ ہو جائیں گے۔ پھر ڈاکے ڈالنے کی ضرورت نہ رہے گی۔“ ”تمہارے منہ میں گھی شکر!“ پتلی بانی مسرت سے بولی۔

کلیان سنگھ کی طرف دیکھ کر ایک سال کے بہادر سنگھ نے خوشی سے ہاتھ پھیلا دیئے۔ کلیان نے اپنے بیٹے کو باہنوں میں لے لیا اور اسے چومتے ہوئے اغواء شدہ مسافروں کی طرف چلا۔

اچانک بلا اپنی سوتے کی انگوٹھی جس میں سلیم کا گیمہ بڑا ہوا تھا اپنی انگلی پر پریشانی سے گھما رہا تھا۔ جب کلیان سنگھ نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

”تم ہی اچرج برلا ہوتا؟“

”ہاں۔“

”سیٹھ گھنشیام داس برلا کے رشتے دار؟“

”جی ہاں۔“

”وہ تمہارے دستخط پہچانتا ہے؟“

”ہاں کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی رہتی ہے۔“

”تو تم آج ہی اسے اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھو اور جیب تک اس خط کا

جواب نہ آئے، تم سب لوگ میری قید میں رہو گے!“

”خط میں کیا لکھوں؟“ اچرج بولا اور جیب سے قلم نکالا۔

”لکھو کہ تم ڈاکوؤں کی قید میں ہو۔ رہائی کے لئے دس لاکھ روپیہ دینا ہوگا! آج

سے ٹھیک پانچ دن شیو پوری میں!“

اچرج برلا نے قلم رکھ دیا۔ بولا۔ ”آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ وہ میرے لئے

دس لاکھ کیا دس روپے نہ دے گا۔ میرا اس کا جھگڑا ہے۔ وہ مجھے پرنس میں ڈالنا چاہتا

تھا لیکن میں نے کہا میں کوتاہیوں کا۔“

”تم۔۔۔ تم؟“ کلیان سنگھ حیرت سے بولا۔ ”تم کوئی ہو؟“

”ہاں۔“ اچرج بولا۔ ”اپنے خاندان میں میں اکیلا کوئی ہوں، اور صرف میں ہی

کوئی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ یہ چودہ مسافر جا رہے ہیں یہ سب کوئی ہیں۔ ہم لوگ

اس بس میں گواٹیار جا رہے تھے ایک کوئی تمیہن میں شامل ہونے کے لئے۔۔۔“

”اور یہ باقی نو لوگ کون ہیں؟“ کلیان سنگھ کی آواز کے مبرا کدم گر گئے تھے۔



اس سے پہلے کہ اچرج بر لا کوئی جواب دیتا، کالے پتوں اور گول درڑھی والا گوری رنگت کا ایک آدمی کالی شیروانی، پٹوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے آگے بڑھا۔ اُس کی شیروانی پر بہت سے پوند لگے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھ کر کلیان سنگھ کو آداب بجا کر کہتے لگا۔

”حضور! اس خاکسار کو ماہر جو پوری کہتے ہیں؟ پھر اپنے باقی ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ استاد برکت علی مانکپوری ہیں۔ غزل میں ان کا جواب نہیں ہے۔ یہ سر آج فرخ آبادی ہیں۔ یہ رجب علی برمانپوری ہیں۔ یہ رادھے کشن دھیرج... لمبی نظیں کہتے ہیں اور ایسے دھیرج سے سناتے ہیں کہ مشاعرے میں سُنتے سُنتے لوگوں کو نیند آئے لگتی ہے۔ یہ۔۔۔“

کلیان سنگھ نے اُسے روک کر کہا۔ ”بس بس! یہ بناؤ۔ تم کون ہو، کیا ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟“

”جی“ ماہر جو پوری آداب بجالاتے ہوئے بولا۔ ”وہی عرض کر رہا ہوں میں۔ ہم لوگ اندور سے ایک مشاعرے میں شرکت کر کے آ رہے تھے اور اب اگرے کے ایک مشاعرے میں جا رہے تھے کہ شیوپوری کے مقام پر ہماری بس ٹیل ہو گئی۔ مہلا ہو اچرج بر لا صاحب کا انہوں نے ازراہ کرم ہمیں اپنی بس میں جگہ دے دی کیا بناؤں حضور! ہمارا آج کتنا نقصان ہوا ہے۔ ہمیں آج رات ہی مشاعرے میں پہنچنا تھا۔“

”اور ہمیں آج ہی رات کوئی سٹیلن میں؟ اچرج بر لا بولے۔

پتلی ہائی کوبے اختیار ہنسی آگئی۔ ہنستے ہنستے دوپہری ہو گئی۔ کلیان سنگھ کی یوپی

دیکھنے کے قابل تھی۔ پتی نے اُس کا بازو پکڑ کر کہا: "اب جو ہو گیا۔ یہ بے چارے غریب کوئی ہیں شاعر ہیں۔ ان سے ہمیں کیا ملے گا۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں آج کی رات آرام سے یہیں رکھو۔ صبح رخصت کر دیتا۔"

پھر اُس نے آگے بڑھ کر بس کے مسافروں سے کہا۔

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ اطمینان سے کھانا کھائیے۔ اس کے بعد بلا جلا

کوئی سمیلن اور مشاعرہ ہوگا۔ یہیں پر۔ صبح آپ کو حفاظت سے اُسی طرح رخصت کر دیا جائے گا، جس طرح آئے تھے آپ لوگ ذرا بھی فکر نہ کریں؟

پتی بھائی نے ایک تلہٹی میں چادریں بچھوا دی تھیں۔ گاؤں تکیے لگوا دیئے تھے۔ پان اور سگریٹ کا بھی بندوبست تھا۔ دو پیڑد میکس بھی روشنی کی بہار دکھا رہے تھے۔ مدتوں کے بعد پتی بانی کو ایسی خوبصورت محفل نصیب ہوئی تھی۔ اس نے بھی دو تین چیزیں گانے سنائیں۔ جنہیں کوئوں اور شاعروں نے بہت سراہا۔

پھر بلا جلا کوئی سمیلن اور مشاعرہ شروع ہوا۔ پتی بانی بیچ بیچ میں داد دیتی جاتی تھی اس کی دیکھا دیکھی باتیں ڈاکو بھی داد دینے لگے اور اچھے شعروں پر جھبسنے لگے۔ اچھر بے للاحیرت زدہ ہو کر بولا۔

"بھئی کمال کر دیا آپ لوگوں نے! یعنی آپ لوگ ڈاکو ہو کر بھی بڑے بڑے

قابل منسٹروں اور نیاؤں سے بڑھ کر صحیح موقع پر داد دیتے ہیں۔"

"واللہ! ایسے خوش ذوق لوگ تو میں نے دلی اور لکھنؤ میں بھی نہیں دیکھے!

ماہر جو نپوری سر بلا کے بولے۔

دو بجے کے قریب محفل برخاست ہوئی۔ آخری غزل ماہر جو نپوری نے سنائی۔

ماہر جو پوری کے دو شعر پتلی کو بہت پسند آئے ۔

بڑے دلچسپ وعدے تھے، بڑے رنگیں دھوکے تھے  
گلوں کی آرزو میں زندگی شعلے اٹھا لائی!  
بتاؤ تو اندھیروں کی قصیلوں سے پرے آخر  
کہاں سے قافلہ گزرا کہاں تک روشنی آئی

پتلی بانی نے مجھوم مجھوم کہ داد دی ۔ پھر کہنے لگی ۔ ”ماہر صاحب ! یہ شعر  
آپ کے ہیں ؟“

جی ہاں ۔

”مجھے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے : پتلی بانی سوچتے ہوئے بولی ۔ ”یہ شعر نور شید احمد  
جانی کے ہیں ۔“

”شروع میں انہیں کے تھے : ”ماہر جو پوری فوراً بول اٹھے : بعد میں میں  
نے انہیں ہتیا لیا ۔“

”کیا مطلب ؟“ پتلی بانی نے حیرت زدہ ہو کر کہا ۔

”مطلب یہ کہ صرف روپے پر ڈاکہ نہیں پڑا شعروں پر بھی ڈاکہ ڈالا جاتا  
ہے ۔ کوئی شخص کا ڈاکہ ہوتا ہے ۔ میں شعروں کا ڈاکہ ہوں !“

پتلی بانی نے عجیب اُداسی سے سر ہلا کے کہا ۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے ڈاکہ زنی  
زندگی کے ہر شعبے میں ہوتی ہے ۔“

”بجائے فرمایا معززہ آپ نے ۔ بجا فرمایا ۔“

”پھر ہمیں ہی جیل میں کیوں ڈالا جاتا ہے ؟ ہمیں ہی پھانسی کیوں دی جاتی

ہے؟ پتلی بائی نے جیسے ہواؤں سے پوچھا۔

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب رات کے ڈونچ رہے تھے۔ محفل شعر و سخن پر خامت ہوئی۔ کلیان سنگھ نے گھڑی دیکھ کر پتلی سے کہا: ”اپنے بہانوں سے کہو دو تین گھنٹے آرام کر لیں۔ صبح سویرے ہی یہاں سے جانا ہوگا۔“

”لیکن ہمیں انہیں کچھ دینا بھی تو ہوگا۔“ پتلی بائی بولی۔

”ہمیں دینا ہوگا؟“ کلیان سنگھ حیران ہو کر بولا۔ ”ہم تو ڈاکو ہیں ہم تو لیتے ہی لیتے ہیں، دیتے کچھ نہیں؟“

”ہم ڈاکو ہیں۔ لیکن یہ تو کوی اور شاعر ہیں۔ ان بے چاروں کا تو نقصان ہوا ہے۔ جس محفل میں پڑھنے جا رہے تھے۔ وہاں انہیں ان کی روزی ملتی؟“

”چلئے کوئی بات نہیں۔ وہاں نہ ہوا یہاں ہمارا کوئی سمیٹن ہو گیا۔“

”اچر ج برلا بولے۔“ ہمیں ایک کوی سمیٹن میں حصہ لینے کے ڈھائی سو ملتے ہیں۔

پتلی نے کلیان سنگھ سے کہا۔ ”انہیں پانچ سو روپے ابھی دے دو اور ریل

کا کر ایہ الگ سے فرسٹ کلاس گا۔“

کلیان سنگھ نے حیرت سے پتلی کی طرف دیکھا۔ پھر اس کا منشا سمجھ کے بولا۔

”ٹھیک ہے تم جیسے جتنا دینا چاہتی ہو، دے دو۔ انہیں خوش خوش

رخصت کرو۔“

جب چوبیس کویوں اور شاعروں کو ان کی فیس سے دگنے دام مل گئے تو وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔ یہ تو انہوں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا!

اچر ج برلا بولے۔

”پتلی بانی جی! میرے خیال میں تو آپ سال میں ایک بار یہیں ضرور یاد کیا  
 کیجئے ہم بہت اچھا کوئی سمیلن کریں گے۔“  
 ماہر جو نیپوری نے کہا: ”اور ایک سالانہ مشاعرہ! میں ہندوستان کے تمام  
 بڑے بڑے شاعروں کو لاتے کا ذمہ لیتا ہوں۔ شعر و ادب کے صحیح قدر دان تو  
 ہمیں چینل کی وادی ہی ہیں۔“

پتلی بانی ہنس کر بولی: ”آپ کی تجویز بہت اچھی ہے۔ میں اس پر غور کروں  
 گی۔ فی الحال تو آپ آرام کیجئے۔ صبحدم اٹھ کر چلنا ہوگا۔“  
 صبحدم جب پارٹی اٹھ کر چلنے کے لئے تیار ہوئی تو چلنے سے پہلے شاعر  
 اور کوئی جن گئے گئے معلوم ہوا کہ چوبیس کے بجائے تیس ہی کی گنتی ہے کون غائب  
 ہے؟ معلوم کرتے کرتے پتہ چلا کہ ماہر جو نیپوری غائب ہیں!  
 انہیں ادھر ادھر غاروں میں ڈھونڈا گیا۔ وہ کہیں نہ ملے۔ آس پاس کی  
 گھاٹیوں میں دیکھا گیا لیکن وہ کہیں نہ ملے۔

سراج فرخ آبادی بولے: ”رات کو میرے قریب سو رہے تھے۔ صبح چار  
 بجے کے قریب ذرا آہٹ سی ہوئی۔ میں نے دیکھا، ماہر صاحب دبے پاؤں  
 باہر جا رہے ہیں۔ میں نے آہستہ سے آواز دے کر کہا: کہاں جا رہے ہو استاد؟  
 بولے: ”ذرا رفع حاجت کے لئے جنگل جا رہا ہوں۔“

”ہو سکتا ہے کسی شیر نے انہیں کھالیا ہو؟“ مائل بھوپالی بولے۔ مائل اور ماہر  
 میں ہمیشہ چشمک رہتی ہے۔

”ہو سکتا ہے کسی پٹر کے نیچے فکرِ سخن میں مشغور ہوں۔“



دھیرج جی نے دوسری راہ سمجھائی۔

”کچھ بھی ہو آپ لوگ اب زیادہ دیر رُک نہیں سکتے۔ کلیان سنگھ بولا: خطرہ بڑھ جائے گا۔ میں آپ کو حفاظت سے سڑک تک پہنچا دیتا ہوں۔ آپ کے جانے کے بعد اگر وہ صاحب کہیں مل گئے تو انہیں بھی آپ کے بعد روانہ کر دیا جائے گا۔“

تینیس کو یوں گونشاعروں کا گروہ کلیان سنگھ کے دس ڈاکوؤں کے ساتھ پتلی ہائی اور کلیان سنگھ کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گیا۔

اُن کے جانے کے دو گھنٹے بعد ماہر جو پوری اپنے پٹے سنبھالے شعر گنگناتے اور اپنی ڈبیہ کھول کر منہ میں پان کی ایک گھوری رکھ کر نیچے جنگل سے آتے دکھائی دیئے۔

پتلی بھائی نے آگے بڑھ کر تہہ بیدی انداز میں اُن سے پوچھا۔ ”کہاں چلے گئے تھے؟ یہاں چاروں طرف ڈھونڈیا پڑی۔ لیکن آپ کہیں نہ ملے!“

”میں راستہ بھول گیا تھا۔“

”لیکن آپ گئے کیوں؟“

”میری عادت ہے۔ صبح سویرے شعر و سخن کی فکر میں گھومنے نکل جاتا ہوں۔ ایک غزل کے دو شعر ہوئے ہیں۔ واللہ! قیامت کے ہیں! بس دو شعر ہوئے ہیں لیکن اکثر شاعروں کے پورے دیوان پر بھاری ہیں! اگر اجازت پاؤں تو عرض کروں۔“

”فرمائیے!“ پتلی نے چپ رہیں ہو کے کہا۔ حالانکہ اس وقت اس کا بچی ذرا بھی نہ چاہتا تھا کہ شعر سنے۔

”عرض کیا ہے؟ ماہر جو پوری جھوم کر بولے۔“

”سحر کا، موسم گل کا، غزل کا نام دیتا ہے  
 تمہیں بھی خوبصورت سا کوئی دیتا ہے  
 تارے شام غم اتنے قریب آئے کہ میں سمجھا  
 نگاہ یار کا شاید کوئی پیغام دیتا ہے  
 پتلی بانی کوٹھوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی آدا سے مسکرا کر بولی: کیا بات ہے، جاکی  
 سے آپ کی کوئی پرانی دشمنی ہے؟ آپ نے آج پھر اسی کی غزل پڑائی!“  
 ”نہیں یہ بات نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

”بات یہ ہے کہ بہت اچھا شاعر ہے۔ مابہر مسکرا کر کہنے لگے۔  
 ”خیر اب میں آپ کو اس مقام پر مزید ڈاکہ زنی کی ترغیب نہ دوں گی۔ آپ اب  
 جلدی سے جانے کے لئے تیار ہو جائیے۔“  
 ”کہاں؟ مابہر نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔  
 ”جہاں بھی آپ کو جانا ہے۔“

”مجھے تو کہیں نہیں جانا ہے!“ مابہر نے بے حد مستحکم لہجے میں انکار کرتے ہوئے  
 کہا۔ ”میری تو منزل آگئی۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ سال بھر مشاعروں میں گھومتا رہتا ہوں۔ کہیں سے چپاں ملتے ہیں۔  
 کہیں سے چائیں۔ کہیں یونی ٹرے دیا جاتا ہے، اور یہاں آتے ہی مجھے آپ نے ایک  
 مشاعرے کے دو سو روپے دے دیئے! ایسے قدر دان مجھے کہاں ملیں گے۔ میں نے

تو ساری زندگی آپ کی خدمت میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے!“  
 ”اسے؟“ پتلی بانی حیران ہو کر بولی۔

”جی ہاں۔ میں آپ کو شعر کہتا سکھا دوں گا۔ آپ مجھے راقص چلانا سکھا دیجئے!“ ماہر نے متحج ہو کر کہا۔ ”شعر و شاعری میں خاک و دھرا ہے۔ زندگی بھر شیر وانی کے پیوند نہیں جاتے۔“ کلیان سنگھ ہنس کر بولا۔ ”مگر ڈاکو کی زندگی کوئی اچھی زندگی نہیں ہوتی۔ اس کے عیش و آرام کی میعاد بہت مختصر ہے۔ آخر میں پھانسی کا تختہ سے یا پولیس کی گولی!“  
 ”کوئی بات نہیں!“ ماہر جو پوری تے کہا۔ ”مرنا تو ایک ہی دن ہے۔ لیکن آپ کے ہاں جب تک جنس گے عیش و آرام سے تو جنس گے۔ کیا بتاؤں کلیان سنگھ جی!“  
 اس ملک میں شاعروں اور کویوں کی وہ قدر نہیں ہے جو ڈاکوؤں کی ہے۔ بس مجھے آپ اپنی گینگ میں شامل کر لیجئے۔ زندگی بھر آپ کو دُعا دوں گا۔“

کلیان سنگھ نے پتلی بانی کی طرف دیکھا۔ پتلی بانی بولی۔ ”پڑا رہنے دو۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھار پرائی عادت کی وجہ سے میرا جی بھی شعر سننے کو چاہتا ہے!“

## جشن حماقت

پچھلے کئی برس سے ممبئی میں جشن حماقت منایا جا رہا ہے۔ اس سال اس جشن حماقت کی صدارت کے لئے مشہور افسانہ نویس جناب کرن شن چندر کو منتخب کیا گیا تھا۔ موصوف نے جو صدارتی خطبہ پڑھا، شائع کیا جا رہا ہے۔

میں نے سنا ہے کہ یہ جشن حماقت کئی سال سے منایا جا رہا ہے مجھے شکانت تھی اور شکانت سے زیادہ حیرت بھی کہ اس سلسلے میں آج تک مجھے کیوں نظر انداز کیا گیا۔ کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے جلسے کی صدارت کا حق دار ہونے کی صلاحیت مجھ میں دوسروں سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن میرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے، اپنے منہ میاں مٹھو یعنی بدھو بننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ آج خود کو جشن حماقت کے صدر کی حیثیت میں پاتا ہوں تو میرا دل فخر و مسرت میرا مطلب ہے فخر و حماقت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ بالآخر میرے احمقانہ کارناموں کا اعتراف آج ہر احمق کو ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے اپنا حق کیسے

پاتا؟ — ظاہر ہے پہلے کام دیکھا جاتا ہے پھر نام دیا جاتا ہے — کچھلے سے کچھلے سال حکومت ہند نے مجھے پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا تھا، اس سال آپ نے حماقت کا تحفہ عطا کیا ہے، تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ان دونوں میں سے کون سا خطاب بڑا ہے، اور آخر ان دونوں میں فرق کیا ہے جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو غالب کے ایک مصرعے نے راہ سمجھائی، جو کچھ اس طرح ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں  
 موت سے پہلے آدمی پدم بھوشن سے تو نجات حاصل کر سکتا ہے، مگر حماقت سے نہیں۔ یہ وہ اعزاز ہے جو عمر کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔  
 ابھی کچھ دن ہوئے سرکار نے مردم شماری کے پردے میں احمق شماری کروائی ہے کیونکہ احمقوں کی صحیح تعداد آج تک کوئی معلوم نہیں کر سکا ہے سنا گیا ہے کہ حکومت کے زیر غور وزارت میں ایک تشعبہ حماقت کے افسانے کا بھی ہے، لیکن اس سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس پورٹ فولیو کے لئے ہمارے بڑے بڑے نیتاؤں میں بڑی رسہ کشی چل رہی ہے جیسے دیکھئے اس پورٹ فولیو کو حاصل کرنے کے لئے اپنی اپنی حماقت کا ڈھنڈورا پیٹنے میں مصروف ہے، حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے نیتاؤں کے آپس میں بہت سے اختلاف ہو سکتے ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ حماقت کے معاملے میں وہ ہمیشہ ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے رہے ہیں، یوں کہ جس شعبے کو بات نکلیے حماقت ہی کا شعبہ معلوم ہوتا ہے۔

یوں بھی سننا ہے کہ کابینہ میں احمقوں کی عامی کھپت کے بعد بھی ایک بڑی تعداد بڑے مستند احمقوں کی باقی بچ رہتی ہے۔ اب کیا کیا جائے کیونکہ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ



الحق زیادہ ہیں اور پورٹ فولیو کم ہیں۔ راستہ یہ نکالا گیا ہے کہ ان میں سے چند حضرات کو محکمہ سفارت کے سربراہ کی حیثیت سے دوسرے ملکوں بھیجا جانا ملے کیا گیا ہے۔ یہ ایک طرح سے اچھا بھی ہے، اب ملکی اور غیر ملکی حماقتوں کا تبادلہ بڑے پیمانے پر کیا جاسکے گا۔ ہوتا تو اب تک یہی رہا ہے، لیکن اب چونکہ ایک سوچی سمجھی حماقت کی تبادلہ پر یہ تبادلہ ہوگا، اس لئے اس سے ایک الحق کو دوسرے الحق سے بہت کچھ سیکھنے کا بھجنے کا موقع مل سکے گا۔ قیاس غالب ہے کہ بعض ملکوں میں اس طرح کے الحقائق موانع فراہم کرتے ہیں بہت دلچسپی لیں گی، اور اس طرح حماقت کا پرچار ہوگا۔ بے وقوفی کا بیو پار ہوگا اور بے عقلی کا کاروبار ہوگا، اور ہمارے ملک کی حماقت میں دن دوئی رات چوگنی تر تری ہوگی۔

حماقت کا مسئلہ صرف سیاسی نوعیت کا نہیں ہے، وہ ادبی اور شعری نوعیت بھی رکھتا ہے، ورنہ آج کی منہ بھارت پر آپ مجھے کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ ایک عرصے سے ہمارے ادبی اور شعری میدان میں حماقت کی چھین جھپٹ بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ جب ادیبوں اور شاعروں میں اس مسئلے پر بڑی تنازعات ہونے لگی، بات بڑھنے لگی، یعنی حماقت بڑھنے لگی تو طے کیا گیا کہ اس طرح تو کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ کیوں نہ سارے الحق آپس میں مل بیٹھ کے کوئی فیصلہ کر لیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ادیب اور شاعر بھی مل بیٹھ کے کوئی فیصلہ کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ اس لئے جب حماقت کے حق داروں کی فہرست بنائی جا رہی تھی، اس وقت ادیبوں اور شاعروں میں جھگڑا ہو گیا۔ کوئی کہتا تھا میرا نام تم سے پہلے ہوگا، کوئی کہتا تھا میرا نام اس کے بعد نہیں ہوگا۔ اپنی بات کو صحیح منوانے کے لئے ادیبوں اور شاعروں نے حماقت کے میدان میں اپنے اپنے کارناموں کی تفصیل پیش کرتے شروع کی، اور یہ بھی پس ہے کہ اپنی اپنی جگہ پر ان

سب لوگوں نے اپنی حماقت حق بجانب ثابت کرتے ہیں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ خیر جب احمقوں کی فائل لسٹ تیار ہو کے آئی تو میرا نام سرفہرست تھا اور بریکٹ میں میرے نام کے ساتھ (احمقوں کا سردار) بھی لکھا تھا۔ میرا دل اپنی حماقت کی اس حوصلہ افزائی پر فطری حماقت سے بارغ بارغ ہو گیا۔ لیکن، میری اس بات سے ٹلی سردار جعفری کو غلط فہمی ہو گئی۔ وہ سمجھے کہ سردار کا مطلب خود سردار جعفری ہیں۔ لیکن جب راجندر سنگھ بیدی نے ایسی بے پناہ احمقانہ بات سنی تو وہ حیران رہ گئے، اور انہوں نے سردار جعفری سے کہا کہ بھائی ادیبوں میں تو بس ایک ہی سردار ہوں، آخر میرا یہ منصب مجھ سے کیوں چھینتے ہو۔ ابھی یہ گفتگو چل ہی رہی تھی کہ کچھ نئے ادیب اور شاعر یعنی کچھ نئے احمق ہماری سیٹھ میں دخل دینے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب ہمارے ادب میں پلٹے احمقوں کی جگہ نہیں ہے۔ اب ادب کے میدان میں ایک سے ایک بڑا اور شان دار احمق اتر چکا ہے، اور اب وقت آ پہنچا ہے کہ نئے احمق پرانے احمقوں سے دستار حماقت چھین کر اپنے سر پر سجالیں۔ اس بات پر ہم جیسے پرانے احمقوں کو ظاہر ہے چپ ہونا پڑا۔ کیونکہ اس بات میں تو کسی بڑے سے بڑے احمق کو بھی شبہ نہیں ہے کہ نئی نسل کے احمقوں نے حماقت کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کے سامنے سارے پرانے احمقوں کی حماقتیں بیچ ہیں۔

آئیے اب ذرا احمقوں کی قسموں پر بھی غور کر لیں۔ جیسے دنیا کی ہر شے کی قسمیں ہوتی ہیں، اسی طرح احمقوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک احمق ریسرچ اسکالر کی دریافت کے مطابق احمقوں کی چند مشہور اور عام قسمیں بیان کرتا ہوں۔ احمق موصوف نے اپنے تجزیس میں لکھا ہے۔

ایک احمق وہ ہوتا ہے جو پیدا ہوتے ہی احمق تسلیم کر لیا جاتا ہے اسے پیدائشی احمق

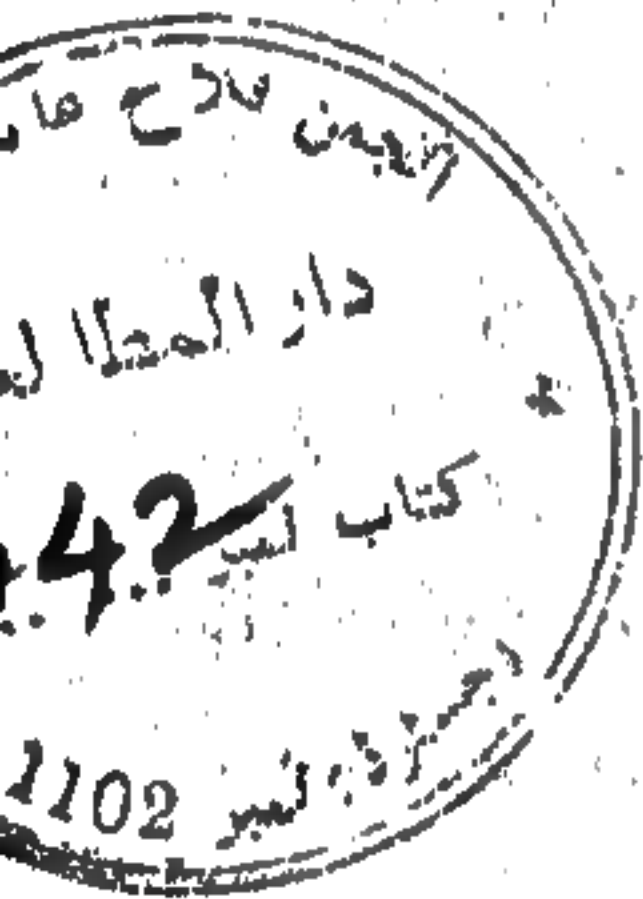
کہتے ہیں۔ دوسرا احمق وہ ہوتا ہے جو ہمیشہ یاروں کے طنز و مزاح کا نشانہ بنتا ہے اور جس کے بغیر کسی گھر، کسی محلے اور کسی محفل میں رونق نہیں ہوتی، اسے آرائشی احمق کہتے ہیں۔ ایک احمق وہ ہوتا ہے جو موقع بے موقع اپنی بیوی یا اپنے حاکم کی تعریف کرتا رہتا ہے اور لاکھ سمجھاتے پر بھی باز نہیں آتا، ایسے احمق کو ستائشی احمق کہا جاتا ہے۔ پھر وہ احمق ہوتے ہیں جو ہر وقت اپنی حماقت سے بور کرتے رہتے ہیں اور جب تک ان کو ڈانٹنا نہ جائے کبھی راہ راست پر نہیں آتے، یہ لوگ تہائشی احمق کہلاتے ہیں۔ احمقوں کی ایک اور قسم وہ ہوتی ہے جو کوئی احمقانہ لطیفہ یا چٹکلا سنانے کی خاطر ایک دوست کے گھر سے دوسرے گھر کی سڑک ناپتے پھرتے ہیں، ایسے لوگ پیائشی احمق کہلاتے ہیں۔ پھر وہ حضرات ہوتے ہیں جو اگر ایک دفعہ آپ کے گھر میں تشریف لے آئیں تو دوبارہ کبھی جانے کا نام نہیں لیتے، ایسے لوگوں کو رہائشی احمق کہا جاتا ہے۔

ایک احمق وہ ہوتا ہے جو محض دوسروں کو خوش رکھنے کی خاطر اپنی حماقت میں دوسرے احمقوں کو بھی شامل کرنا رہتا ہے، ایسے لوگوں کو خوش باش احمق کہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اندر سے بالکل احمق نہیں ہوتے، بلکہ اپنی عقل مندی پر حماقت کا لبادہ اوڑھ کر محض شہرت حاصل کرنے کے لئے ہماری محفل میں گھس جاتے ہیں۔ ایسے لوگ سازشی احمق کہلاتے ہیں۔ مون سون کے دنوں میں آپ نے کچھ لوگوں کو بغیر چھپاتے اور برساتی کے سڑکوں پر پہل قدمی کرتے دیکھا ہوگا، ہم انہیں بارشی احمق کہتے ہیں۔ پھر ایک احمق وہ ہوتا ہے جسے عوام کے اصرار پر مسند صداقت پر بیٹھا کے اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو فرائشی احمق کہا جاتا ہے۔ احمقوں کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو ہر جشن حماقت میں پانچ روپے کا ٹکٹ خرچ کر کے سب سے آگے کی کرسیوں پر بیٹھ

جانتے ہیں، یہ لوگ نمائشی احمق ہوتے ہیں۔ احمقوں کی قسمیں کہاں تک بیان کی جائیں، سچ بات تو یہ ہے کہ اس دنیا میں جتنے آدمی ہیں اتنے احمق موجود ہیں۔ آج کل مرد اور عورت کے مساوی حقوق کا زمانہ ہے، اس لئے بغیر کسی رو و قدح کے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ حماقت کے میدان میں عورتیں مردوں کے برابر کی شریک ہیں، بلکہ اکثر اوقات ان پر بازی لے جاتی ہیں۔ یوں کہنا کہ عورت مرد کی نصف بہتر ہے، اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ عورت مرد سے بڑی احمق ہے۔ بلکہ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو حماقت کو صرف عورت کے پیدا کنشی حقوق میں شمار کرتے ہیں اور حلد سے آدم کے نکلنے کو بھی عورت کی حماقت پر مبنی سمجھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ امر اب پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ممکن ہے مردوں نے دوسرے شعبوں میں پہل کی ہو، لیکن حماقت کے میدان میں صرف عورت نے پہل کی ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ کچھ کہوں گا تو مناسب نہ ہوگا۔ آخر اس بحث کے بعد مجھے بھی تو گھر جانا ہے۔۔۔۔۔

آخر اس حماقت کے سلسلے میں ایک سنجیدہ بات کا ضرور ذکر کرنا چاہوں گا۔ آج کل حماقت کے مقابلے میں عقل مندی پر بہت زور دیا جانے لگا ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں عقل مندی کو فائق اور حماقت کو کمتر خیال کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ دھوکے دھڑی سے روپیہ کمانا عقل مندی ہے اور ایمانداری سے محنت کرنا حماقت۔ دوسروں کو لوٹ کے اپنی جیب بھرنا عقل مندی ہے اور کسی ضرورت مند کی حاجت روا کرنا حماقت۔ ایک ملک کی دوسرے ملک پر جارحانہ حملہ آوری عقل مندی ہے اور اپنے ملک کی چار دیواری کے اندر امن و چین سے بیٹھ رہنا حماقت۔ جس بات میں صرف اپنا فائدہ نظر آتا ہو اس پر عمل کرنا عقل مندی ہے اور جس میں دوسروں کے فائدے کا امکان ہو اس پر عمل کرنا حماقت۔ اس عقل مندی کے پردے میں آج دنیا میں جگہ جگہ جگمگ ہو رہی ہیں۔ بے گناہوں

کا قتل عام ہو رہا ہے۔ خود غرضی اور نفسا نفسی کا دور دورہ ہے۔ امیر پہلے سے زیادہ امیر  
 اور غریب پہلے سے زیادہ غریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اے کاش اگر ہم اس عقل مندی کو چھوڑ  
 کر چند لمحوں کے لئے احمق بن جایا کریں تو ہماری زندگی کسی قدر معصوم خوب صورت، دلکش  
 اور مسرتوں سے لبریز ہو جائے۔





## تھالی کا بینگن

تو جناب جب میر پور میں میرا دھندہ کسی طرح سے نہ چلا فاقے پر فاقے ہونے لگے اور جیب میں آخری اٹھتی رہ گئی تو میں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ گھر میں تھوڑا سا آٹا بھی نہیں ہے کیا؟

وہ نیک بخت بولی: چار چپاتی کا ہو گا۔

میں نے جیب سے آخری اٹھتی نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا: جا بازار سے بینگن لے آ، آج چپاتی کے ساتھ بینگن کی بھاجی کھالیں گے۔ وہ نیک بخت بہت فکر مند ہو کر بولی: اس وقت تو کھالیں گے شام کے کھانے کا کیا ہو گا؟

تو فکر نہ کر وہ اوپر والا دے گا۔ میں نے کہا: پھر میری نظر شیشے کے اس بکس پر پڑی جس میں چھوٹا سا تاج محل رکھا ہوا تھا۔ یہ تاج محل میں نے اپنی بیوی کے لئے نئی شادی کے دنوں میں آگرہ میں خریدا تھا۔ اور تاج محل کو دیکھ کر ہی خریدا تھا۔ محبت بھی کیا

چیز ہے اس بیس روپے کے تحفے کو پا کر میری بیوی کا چاند سا کھڑا گلابی ہو گیا تھا۔  
 اس وقت جب میں نے اس خیشے کے تاج محل کو دیکھ کر کہا: کچھ نہ ہوا تو اس کھلونے  
 کو بیچ دیں گے۔ تو جناب اس کا چہرہ ایسا پیلا پڑ گیا جیسے کسی نے یکایک اس کے چہرے کا سارا  
 خون کھینچ لیا ہو، خوف مجبوری اور نا اُمیدی کے ملے جلے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں  
 بولی: ”نہیں میں اسے بیچنے نہ دوں گی یہ تو۔۔۔ یہ تو میرے سہاگ کی نشانی ہے۔“  
 میں نے اس کے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے بہت نرمی سے کہا: ”اچھا نہیں بیچیں  
 گے اسے، کچھ اور بیچ دیں گے ہو سکتا ہے وہ اوپر والا کوئی اور سبیل پیدا کر دے، تو اس وقت  
 جا کر بیگن تو لے آ بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔“

وہ بازار سے بیگن لے کے آئی رسوئی میں بیٹھ کر اور سامنے لکڑی کے چھوٹے سے پڑے  
 پر رکھ کر اس نے پہلا بیگن کاٹا ہی تھا کہ اسے اندر سے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ ارے اس کے  
 منہ سے بے اختیار نکلا: ”کیا ہے؟“ میں رسوئی کے اندر گیا اس نے مجھے کٹا ہوا بیگن دکھایا  
 ”دیکھو تو اس کے اندر کیا لکھا ہے؟“ میں نے غور سے بیگن کو دیکھا۔ بیگن کے اندر بیگن کے  
 بیج کچھ اس طرح ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے کہ لفظ اللہ صاف دکھائی دے رہا  
 تھا۔ ”ہے بھگوان“ میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ”یہ تو مسلمانوں کا اللہ ہے۔“  
 محلہ پور بیاں جہاں میں رہتا تھا Mix محلہ ہے یعنی آدمی آبادی ہندوؤں  
 کی ہے آدمی مسلمانوں کی۔ لوگ جوتی درجوتی اس بیگن کو دیکھنے کے لئے آنے لگے ہندوؤں  
 اور کرسٹیانوں کو تو اس بیگن پر یقین نہ آیا لیکن حاجی میاں اچھن اس پر ایمان لے آئے  
 پہلی نذر نیاز انہوں نے ہی دی۔ میں نے اس کے ہونے بیگن کو اس خیشے کے کبس میں  
 رکھ دیا جس میں تاج محل رکھا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک مسلمان نے اس کے پیچے ہر اکڑا بچھا

دیا۔ منقن میان تمباکو والے نے قرآن خوانی شروع کر دی۔ پھر کیا تھا شہر کے سارے مسلمانوں میں اس بیگن کا چہرہ چاشروع ہو گیا۔ جناب سمٹی پورہ سے مہین پور تک اور بجواڑ سے کمانی گڑھ تک اور ادھر ٹیلا میاں کے چوک سے لے کر محلہ کوٹھیاران تک سے لوگ ہمارے بیگن کو دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ لوگ باگ بونے ایک کافر کے گھر میں ایمان لے آیا جلوہ دکھایا ہے۔ نذر نیاز بڑھتی گئی۔ پہلے پندرہ دنوں میں سات ہزار سے اوپر وصول ہو گئے جس میں سے تین سو روپے سائیں کرم شاہ کو دیئے جو چرس کا دم لگا کر ہر وقت اس بیگن کی نگرانی کرتا تھا۔

پندرہ بیس دن کے بعد جب لوگوں کا جوش ایمان ٹھنڈا پڑا دکھائی دیا تو ایک رات جب سائیں چرس کا دم لگا کر بے سدھ پڑا تھا میں نے آہستہ سے اپنی بیوی کو جگایا اور کہے ہوئے بیگن کے اوپر سے تیشے کا بکس ہٹا کر کہا دیکھو کیا دکھائی دیتا ہے۔ وہ بولی: اللہ میں نے کئے ہوئے بیگن کا رخ ذرا سا سرکایا اور پوچھا۔ اب کیا دکھائی دیتا ہے۔

”ادم۔ اسے یہ تو ادم ہے۔“ میری بیوی نے انگلی تھوڑی پر رکھ لی۔ اس کے سارے چہرے پر استعجاب تھا۔ راتوں رات میں نے پنڈت دیال کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اسے بلا کر کہے ہوئے بیگن کا بدلا ہوا رخ دکھایا۔ پنڈت دیال نے چیخ کر کہا ”اسے یہ تو ادم ہے ادم۔ اتنے دنوں تک مسلمان دھوکہ دیتے رہے۔“ اس کی چیخ سن کر سائیں کرم شاہ جاگ گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے وہ پھٹی پھٹی سڑخ آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا پنڈت رام دیال نے اسے لات مار کر کہا ”نکل بے بہار ادھر بھڑکتا کرتا ہے ادم کو اللہ بناتا ہے۔“

بس پھر کیا تھا سارے شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ کئے ہوئے بیگن

کے اندر دراصل اُدم کا نام کھدا ہوا ہے۔ پنڈت رام دیال نے چار بجائے یار رات دن اُرتی ہونے لگی بھین گائے۔ نے لگے چڑھاوا چڑھنے لگا۔ میں نے رام دیال کا حصہ بھی رکھ دیا تھا کہ جو محنت کرے اسے بھی پھل ملنا چاہیے، لیکن بنگلہ پر ملکیت میری ہی رہی۔ اب شہر کے بڑے بڑے سنت جوگی اور شددھ ہاتما اور سوامی اس بنگلہ کو دیکھنے کے لئے آنے لگے جہاں اللہ نے اُدم بن کر اس کئے ہوئے بنگلہ میں گویا مسلمانوں کو شکست دی تھی اور پانی پت کی ٹینوں لڑائیوں کا بدلہ لایا تھا۔ شہر میں جا بجا لکچر ہو رہے تھے ہندو دھرم کی فضیلت پر دھواں دھار بھاشن دیئے جا رہے تھے شہر میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

ہندو کہتے تھے یہ اُدم ہے مسلمان کہتے تھے یہ اللہ ہے۔

اُدم

اللہ

ہری اُدم سنت۔ اللہ اکبر۔ اگلے پچیس دنوں میں کوئی پندرہ بیس ہزار کا چڑھاوا چڑھا اور سونے کی انگوٹھیاں اور ایک سونے کا کنگن بھی ہاتھ آیا لیکن آہستہ آہستہ لوگوں کا شمار پھر ڈھلنے لگا۔ تو جناب میں نے سوچا اب کوئی اور ترکیب لڑانی چاہیئے سوچ سوچ کر جب ایک رات پنڈت رام دیال بنگلہ کے نشے میں دھت فرش پر لیٹے ہوئے تھے میں نے اپنی بیوی کو جگا کر کہا۔ ”نیک بخت دیکھو اس نشے کے بکس کے اندر کئے ہوئے بنگلہ کے اندر انہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟“

”اُدم ہے صاف اُدم ہے۔“ میں نے اُدم کا زاویہ ذرا سا اور سر کا دیا اور پوچھا ”اب بتاؤ کیا دکھائی دیتا ہے؟“ دیکھ کر گھبرا گئی۔ منہ میں انگلی ڈال کر بولی: ”ہے

رام یہ تو کراس ہے کہ سٹانوں کی صلیب ہے۔

شش : میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا : بس کسی سے کچھ نہ کہنا

صبح تک چپ رہنا ہوگا۔ کل اتوار ہے کل صبح میں پادری ڈیورینڈ سے ملوں گا۔

کے ہوئے بیگن میں مسیحی صلیب کو دیکھنے کے لئے پادری ڈیورینڈ اپنے ساتھ گیارہ

عیسائیوں کو لے کر آئے اور بیگن کی صلیب دیکھ کر اپنے سینے پر کراس بنانے لگے اور عیسائیوں

کے بھجن گانے لگے اور سر پر جالی دار رد مال اوڑھے خوب صورت فراک پہنے سڈول سی

پنڈلیوں والی عورتیں اس معجزے کو دیکھ کر نہال ہوتی گئیں شہر میں تناؤ اور بھی بڑھ

گیا۔ ہندو کہتے تھے اس بیگن میں ادم ہے، مسلمان کہتے تھے اللہ ہے، عیسائی کہتے

تھے صلیب ہے، بڑھتے بڑھتے ایک دوسرے پر پتھر پھینکے جانے لگے۔ اکا دکا چہرے

بازاری کی وارداتیں ہوتے لگیں سستی پورہ میں دو ہندو مار ڈالے گئے اور مہتری محلے میں

تین مسلمان۔ ایک عیسائی شہر کے بڑے چوک میں ہلاک کر دیا گیا شہر میں دفعہ ۴۴ نافذ کر

دی گئی۔

جس دن میری گرفتاری عمل میں آنے والی تھی اس سے پہلے دن کی رات میں نے

بیگن کو ملوی میں پھینک دیا گھر کا سارا سامان باندھ لیا اور بیوی سے کہا : کسی دوسرے

شہر میں چل کر دوسرا صند اکریں گے :

”تو جناب تنب سے میں بمبئی میں ہوں۔ میرم پور کے ان دو ہینوں میں جو رقم میں

نے کمائی تھی اس سے ایک ٹیکسی خرید لی ہے اب چار سال سے اس ٹیکسی کو چلاتا ہوں

اور ایمانداری کی روزی کھاتا ہوں : آٹا کہہ کر میں نے یار کی میز سے اپنا گلاس اٹھایا اور

آخری گھونٹ لے کر اسے خالی کر دیا۔ یکایک میری نگاہ میز کی اس سطح پر گئی جہاں میرے



گلاس کے شیشے کے پیئدے تے ایک گیلان شان بنا دیا تھا میں نے اپنے دوسرے ساتھی  
ٹیکسی ڈرائیور محمد بھائی سے کہا: "محمد بھائی دیکھو تو اس گلاس کے پیئدے کے نیچے کیا نشان  
بن گیا ہے اوم ہے کہ اللہ؟"

محمد بھائی نے غور سے نشان کو دیکھا مجھے دیکھا پھر میری پیٹھ پر زور سے ہاتھ مار  
کر کہا: "اے سارے یہ بمبئی ہے یہاں نہ اوم ہے نہ اللہ نہ حبیب جو کچھ ہے روپیہ ہے  
بیس روپیہ۔" اتنا کہہ کر محمد بھائی نے میز پر ہاتھ پھیر کر پانی کے نشان کو حرت غلط کی  
طرح مٹا دیا۔

## میرا دوست

میرا دوست۔ لیکن میں اپنے کس کس دوست کا ذکر کروں۔ میرا دوست ایک تو وہ ہے جو ذرا شاعر مزاج ہے اور مجھ سے باتیں کم کرتا ہے۔ لیکن میری بیوی سے زیادہ باتیں کرتا ہے۔ کہیں آپ اس کا الٹا سیدھا مطلب نہ لے لیں۔ دراصل بڑا ہی معصوم جانور ہے اور زیادہ تر میری بیوی سے متعلق ہی باتیں کرتا ہے۔ بڑی ہی معصوم بھولی بھالی باتیں ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر اسے معلوم ہے کہ میں کھانے میں کدو سے سخت نفرت کرتا ہوں۔ ہر وہ شے جو دیکھنے میں یا کھانے میں کدو سے مشابہت رکھتی ہے اس سے مجھے بڑی سخت نفرت ہے۔ چاہے وہ آدمی ہو یا بستی ترکاری میرے دوست کو بھی اس کا اچھی طرح سے علم ہے۔ اسی لئے وہ بڑے ہی مسکین انداز میں میری بیوی سے کہتا ہے۔

”میں دیکھ رہا ہوں چند دنوں سے آپ کے خاوند کا چہرہ آرا سا ہے۔“

”بیوی کہتی ہے: ہاں میں بھی کچھ ایسا محسوس کر رہی تھی۔“

”شاعر مزاج دوست کہتا ہے: کہیں کچھ کھانے میں کوئی کمی تو نہیں۔“

”نہیں تو۔“ بیوی اب کے بڑے بھروسے سے کہتی ہے۔

”شاعر مزاج دوست سر ہلا کے کہتا ہے: پھر ان کے چہرے کی رنگت

سبزی مائل زرد کیوں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خوراک میں وٹامن نفی

گ کی کمی ہے۔ ایک دفعہ میرے چہرے کی رنگت بھی اسی طرح کی ہو گئی

تھی۔ تو۔“

”تو۔“ میری بیوی جلدی سے پوچھتی ہے۔

”تو میرا دوست بڑی خطرناک تلامبیت سے جواب دیتا ہے: تو ڈاکٹر نے

مجھے صبح و شام کدو کی بھاجی کھانے کو دی تھی۔ میں دوسرے ہی پھینے مچلا

چنگا ہو گیا۔“

اب میری بیوی سر ہلا کہہ رہی ہے۔ مگر وہ تو کدو کھاتے ہی نہیں۔ اس لئے

وٹامن نفی گ کی کمی کیسے پوری ہوگی۔“

”یہی تو مصیبت ہے بھائی: میرا شاعر مزاج دوست افسردگی سے سر ہلاتے

ہوئے کہتا ہے: تم ان کی بے جانائز برداری کرتی رہتی ہو اور ان کی صحت

خراب ہوتی جاتی ہے۔ یہ وٹامن نفی گ کی کمی کیسے پوری ہوگی۔“

”تو میں کیا کروں۔“

”کدو مچلاؤ۔“

”اور اگر وہ نہ کھائیں“

”کیسے نہیں کھائیں گے۔ تم کھلاؤ تو۔ ایک روز نہیں کھائیں گے۔ دو روز نہیں کھائیں گے۔ آخر جھک مار کر کھائیں گے؟“

چنانچہ اس مکالمے کے فوراً ہی بعد بندے کے گھر میں روز کدو کی بھاجی ٹیبل پر دھری ہوتی ہے۔ کبھی کدو کا حلوہ کبھی کدو کا رائتہ کبھی کدو کا شوربہ اور کبھی کدو کا ملغوبہ، روز میز پر کسی نہ کسی صورت میں کدو دھرا ہوتا ہے جسے کھا کے اچھی بھلی رنگت سنبری مائل زرد ہوتی جاتی ہے بیوی سکراتی رہتی ہے۔ لیکن آپ کو پتہ نہیں لگ سکتا کہ کدو کہاں سے آیا ہے۔ دوست اور دشمن کی پہچان ایک یہ بھی ہے کہ دشمن کی دشمنی کو آپ فوراً پہچان سکتے ہیں لیکن دوست کی دوستی کبھی نہیں پہچان سکتے۔ خصوصاً ایسا دوست جو آپ کی بیوی کے ذریعہ آپ کو کدو کھلاتے کا عادی ہو۔

لیکن میرا دوست جو مجھے کدو کھلاتا ہے۔ اس دوست کے مقابلے میں اصرار ہے۔ جو مجھے غم کھلاتا ہے۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ کدو کھانے اور غم کھانے میں بہت فرق ہے۔ گو ذائقہ دونوں کا بڑا ہوتا ہے۔ پھر بھی کدو کھانے کھاتے آپ کو تپ دق نہیں ہو سکتا۔ لیکن متواتر غم کھانے سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے میرا وہ دوست جو مجھے اکثر غم کھلاتا ہے۔ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔

اس کی تکنیک ہی عجیب ہے۔ دوسرے دوست تو اس وقت گھر میں آتے ہیں جب میں گھر پہ ہوتا ہوں۔ وہ بالعموم اس وقت آتا ہے جب میں گھر پہ نہیں ہوتا ہوں۔ وہ بڑی جلدی میں تیز تیز قدم اٹھاتے اندر داخل ہوتا ہے اور آتے ہی

مجھے زور زور سے آوازیں دیتے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ پھر ٹیبل پر پڑے ہوئے پھل دان میں سے سیب انگور ناشپاتی کھانے میں مصروف ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ میری بیوی سے باتیں کرتا جاتا ہے۔

”تعجب ہے ابھی تک نہیں آئے؟“ وہ سوال کرتا ہے۔  
میری بیوی کہتی ہے: ”اس میں تعجب کی کیا بات ہے وہ اکثر اس وقت گھر پر نہیں ہوتے؟“

”تعجب کی کیا بات ہے مجھ سے تو اسی وقت ملنے کو کہا تھا۔ دوپہر کو سینما جاتے ہوئے ملے تھے؟“

”سینما کے اندر جاتے ہوئے؟“ میری بیوی گھبرا کے پوچھتی ہے۔

”ہاں اہاں! میرا دوست انگوروں کا ایک گچھا منہ میں ڈال کے جواب دیتا ہے۔ ان کے ساتھ میں غالباً آپ کی وہی رشتہ دار خلیں وہ جو جوان سی ہیں اور خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں۔ بال سنہری اور کٹے ہوئے؟“

”مگر میری تو کوئی ایسی رشتہ دار نہیں ہیں۔“ میری بیوی اور میں گھبرا کر جواب دیتی ہے۔ ”جو خوبصورت ہو، جوان ہو اور جس کے سنہری بال کٹے ہوئے ہوں۔“

میرا دوست ادھا سیب منہ میں ڈال کر کہتا ہے: ”تو جاتے دیکھو۔ کوئی اور ہوں گی۔“ آجائیں گے سینما دیکھ کے وہ لوگ۔

اس گفتگو کے بعد میرا دوست ناشپاتی کاٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور میری بیوی میکے جانے کے لئے سامان ہاندھنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔



تھوڑی دیر کے بعد اس کی سسکیوں کی آہستہ آہستہ آواز، میرے دوست کے کانوں میں پڑتی ہے۔ اور آپ بڑی خندہ پیشانی سے انہیں درسِ حیات دینے لگتے ہیں۔

• گھبرائیے نہیں بھائی۔ زندگی میں ایسا ہی ہوتا ہے؟

• بھاڑ میں جائے ایسی زندگی؟

• ممکن ہے بھائی مجھے دھوکا ہوا ہو؟

• نہیں جی میں سب سمجھتی ہوں۔ وہ ہیں ہی ایسے؟

• فرض کیجئے کہ ایسے ہیں۔ بھائی، پھر بھی انہیں راہِ راست پر لاتا آپ

کا کام ہے؟

• یہاں میں نے کوئی سکول نہیں کھولا ہوا ہے؟

• بھائی آپ بھی غضب کرتی ہیں۔ آپ ہی نے انہیں ایسی ڈھیل دے

رکھی ہے۔ ورنہ یوں تباہ نہ ہوتے۔ سچ کہتا ہوں بھائی جب تمہاری موت

دیکھتا ہوں تو کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ کہنے کو تو وہ میرا دوست ہے۔ مگر میں اس کا

یہ ظلم نہیں دیکھ سکتا میں اس کو ہزار بار سمجھاتا ہوں مگر کیا کروں، وہ میری سُننا

ہی نہیں۔ کم بخت ظالم۔ بد معاش۔

اور وہ — میری بیوی رور و کر کہتی ہے: بس ان کے دوستوں میں

تمہیں سب سے اچھے ہو؟

• بھائی تمہاری جیب میں دس روپے ہیں۔ میرا دوست بڑی معصومیت

سے پوچھتا ہے۔

اور پھر وہ دس روپے لے کے چلا جاتا ہے۔ اور جیب میں گھر آتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ گھر میں بجلی ٹیلی ہو فون ہے اور موسم تہی کی روشنی میں دسترخوان پر سیب کے ٹکڑے پڑے ہیں اور میری بیوی میکے چلی گئی ہے۔ تو میں فوراً سمجھ جاتا ہوں کہ میرا دوست آیا ہو گا۔ وہی جو ہمیشہ میری غیر حاضری میں آتا ہے۔ اور دس بیس روپے لے کے میری بیوی کا اسباب بندھوا کے اسے میکے بھیج دیتا ہے۔ دوست اور دشمن کی پہچان ایک یہ بھی ہے کہ دشمن مردانہ وار آپ پر حملہ کرتا ہے۔ دوست "عورتانہ وار" بھی آپ پر حملہ کر سکتا ہے۔ !

لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ اس طرح دس بیس روپے کھوتے سے میرا زیادہ نقصان تو ہو نہیں سکتا۔ لیکن گھبرا ئے نہیں اس کے لئے میرا دوسرا دوست موجود ہے جو اس کام کو وہاں سے ضرور لے کر آتا ہے جہاں سے میرے پہلے دوست تھے اسے نامتھام چھوڑا تھا۔ دوست اور دشمن کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ دشمن دشمن کی مدد نہیں کرتا۔ لیکن دوست دوست کی مدد ضرور کرتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سچا دوست وہی ہے جو مصیبت میں مدد کرتا ہے۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ سچا دوست نہ صرف مصیبت میں مدد کرتا ہے بلکہ وہ مصیبت بھی خود ہی لانا ہے۔ اور ایک مصیبت ہی نہیں بلکہ بہت سی مصیبتیں اکٹھی کر کے لے آتا ہے تاکہ مدد کرنے میں آسانی رہے۔

ایک اسی قسم کا سچا دوست میرا دوست ہے جو مجھے اکثر کوئی نہ کوئی نیا بزنس ضرور لے کر آئے کے لئے کہتا رہتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگا: بھی تم ہاتھ پر ہاتھ کیوں

دھرے بیٹھے رہتے ہو۔ کوئی بڑا دھندا کیوں نہیں کرتے۔  
کیا کروں ؟

”فلم کا بزنس کرو۔ بڑا نفع ہے۔ بڑا دھندا ہے۔ وہ تم نے فلم دیکھی تھی بندر  
ریکھا کہتے ہیں۔ اس میں پروڈیوسر کو ڈھائی گروڑ کا فائدہ ہوا۔  
چنانچہ ہم نے اپنے دوست کی باتوں میں اس کے ساتھ لاکھ کا نقصان کر ڈالا  
بڑا دھندا تھا۔ اس لئے سب کو فائدہ ہوا سوائے ہمارے۔ اب ہمارے دوست  
نے کہا : دراصل دوست بڑے دھندے میں بڑا خطرہ ہے۔ اب تم چھوٹا دھندا کرو  
کون سا چھوٹا دھندا کروں ؟

یہی پان کی دکانیں بہت سی خرید ڈالو۔ ہر گڑ پر شہر میں ایک پان کی دکان  
تمہاری ہو جائے اور ہر دکان پر تمہارا اپنا نوکر ہو۔ کوئی ایک پچاس، سو دکانیں  
کم از کم کھول لو۔ چھوٹا سا دھندا ہے۔ ہر دکان سے روز پانچ روپے نفع آتا  
ہے۔ سو دکانوں کا پانچ سو روپیہ روز آئے گا۔ سال بھر کا تم حساب کر لو۔  
بڑا خوبصورت سا دھندا تھا۔ سال بھر کے بعد حساب کیا۔ معلوم ہوا کہ اس  
سے تو فلم کا دھندا کیا بڑا تھا۔ بندر ریکھا بتاتے بتاتے بنارس پان بیچنے لگے معلوم  
ہوا شہر کے بیچ میں جو بڑا ہوٹل اپنا تھا وہ اب اپنا نہیں ہے اور موٹر دوست  
نے گروہی رکھ لی ہے۔ اور اب وہ اس کے اسٹیرنگ وھیل پر سر جھک کے مجھ  
سے کہتا ہے : دوست یہ سب دھندے پرانے ہو چکے۔ اب کوئی نیا دھندا کرو۔  
”کون سا نیا دھندا ؟

”پلاسٹک کی چوڑیاں تیار کرو۔

چنانچہ اب کے میں نے نیا دھندا کیا۔ یہ میرا آخری دھندا تھا۔ میں نے پلاسٹک کی چوڑیاں تیار کیں۔ اور پھر انہیں پہن کر اپنے گھر بیٹھ گیا۔ اب چھوٹے بڑے نے پرانے سب دھندے ختم ہو چکے۔

لیکن گو دھندے ختم ہو جاتے ہیں۔ دوست کبھی ختم نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوست اور دشمن کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ آدمی دشمن کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن دوست کا مقابلہ کسی حالت میں نہیں کر سکتا۔ یہ ذمہ داری کے خلاف ہو گا۔ اس کا تجربہ مجھے اپنی تازہ ترین علالت کے دوران میں ہوا۔ کیونکہ جیسا کہ بزرگوں نے کہا ہے۔ جب سب دھندے ختم ہو جاتے ہیں تو بیماری شروع ہو جاتی ہے۔ اب کے مجھے میرے ڈاکٹر دوست نے بتایا کہ مجھے کچھ نہ ہونے کی بیماری ہے۔ آپ یہ سن کر ضرور حیران ہوں گے کہ یہ کچھ نہ ہونے کی بیماری کیا ہوتی ہے۔ تو سینے بیماری دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو ہوتی ہیں۔ یعنی آپ کو سردی ہو گئی۔ مجھے گرمی ہو گئی۔ آپ کو پیش ہو گئی۔ مجھے دق ہو گئی۔ آپ کو کڑھ ہو گئی۔ مجھے حیرت ہو گئی۔

... یہ ہو گئیں ہونے کی بیماریاں۔ دوسری ہوتی ہیں نہ ہونے کی بیماریاں۔ جن میں کچھ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے جسم میں کیلشیم نہیں ہوتا ہے۔ تو آپ کو کیلشیم نہ ہونے کی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ لوہا نہ ہو تو لوہا نہ ہونے کی بیماری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وٹامن قاسفورس، نمک اور مٹی کا تیل نہیں ہوتا تو جسم کا STOVE بجھا بجھا سا رہتا ہے۔ چنانچہ اب کے میری تازہ علالت جسم میں آئیوڈین کے نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ ڈاکٹر

نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مجھے ایک عمدہ سا انجکشن دیا اور چلا گیا۔ اس کے بعد میری شامت آئی۔ میرا مطلب ہے میرا دوست آیا۔

میرا یہ دوست بڑا معصوم اور بھولا بھالا ہے۔ اس کا لباس ڈھیلّا ڈھالا ہے اور وہ ویسی ٹوٹکوں کا متوالا ہے۔ گویا بالکل گڑبڑ بھالا ہے۔ وہ ہنسنے ہی لبوترے سامنے بنائے میرے سر پرانے بیٹھ کے مجھ سے پوچھنے لگا۔

”کیا تکلیف ہے دوست؟“

”جسم میں آیوڈین نہیں ہے؟“

”نوشکیر آیوڈین پیو۔ میرے گھر پر رکھی ہے؟“

”میں نے کہا: نوشکیر آیوڈین پیتے نہیں لگاتے ہیں؟“

”وہ بولا: میرے خیال میں گھوڑوں کو پلاتے ہیں؟“

”میں نے کہا: میں گھوڑا نہیں ہوں؟“

”وہ بولا: معاف کرنا۔ میں بھول گیا۔ میں نے سمجھا۔ میں ریس کورس میں

بیٹھا ہوں؟“

اس کے بعد تھوڑی دیر تک وہ چپ رہا۔ پھر سوچ سوچ کر بولا: میرے

خیال میں تم ہلدی پیو؟ تو اچھا ہے؟“

”میں نے کہا: تمہیں ہلدی کا خیال کیوں آیا؟“

”وہ بولا: ہلدی اور آیوڈین کا رنگ ملتا ہے۔ اس لئے مزاج بھی ملتا ہوگا اور

تاثیر بھی۔ اس لئے تم ہلدی ضرور پیو۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں سب سمجھتا ہوں

دیکھو اب تم مند نہ کرو تمہیں سمجھتے ہو میں تمہارے بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں؟“



میرے دوست میں یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ سب سمجھتا ہے اور میں کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور میں کچھ نہیں جانتا ہوں۔ وہ سب کچھ دیکھتا تھا اور میں کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ گو میرا دوست ڈاکٹر ویدیا حکیم نہیں ہے۔ تو کیا ہوا۔ وہ نہیں ہے مگر اس کا دادا تو تھا۔ اور اس کے دادا جی کے بتائے ہوئے ٹوٹکے آج تک ہمارے گھر سے قبرستان تک چلتے ہیں۔ اس لئے اس نے اصرار کر کے مجھے ہلدی پانی میں گھول کر پلا دی۔ پھر میرے پیٹ پر ہلدی کا لپ کر دیا۔ میری آنکھوں میں ہلدی کا سرمہ لگا دیا اور میرے ماتھے پر ہلدی بکھیر کر مجھے اپنی دانست میں اگلے جہاں پہنچا کر مجھ سے رخصت ہو گیا۔ یہی سچے دوست اور دشمن کی پہچان ہے کہ دشمن آپ کی خوبیوں پر نگاہ رکھتا ہے اور آپ کی کمزوری پر حملہ کرتا ہے۔ دشمن کا وار کبھی نہ کبھی خالی چلا جاتا ہے۔ لیکن دوست کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔

پرسوں میرا دوست اپنے خاندانی ٹوٹکوں کے طفیل مر گیا۔ اور مرتے وقت مجھے ایک بیوہ اور گیارہ بچے اور بہت سے بے چوڑے قرضے کی ذمہ داری سونپ گیا۔ وصیت میں میرے لئے اپنا پیارا خارش زدہ کتا بھی میرے حوالے کر گیا۔ آج کل میں روز اس خارش زدہ کتے کو نہلاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ دشمن کی دشمنی اس کے مرنے پر ختم ہو جاتی ہے لیکن دوست کی دوستی اس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ بلکہ قیامت تک آپ کا ساتھ دیتی جاتی ہے۔

## بھینی بھینی بدلو

حامدہ نے آنکھوں میں کابل کی لکیر لگا کر دنیا بھینپا۔ پھر اپنے گلابی ہونٹوں پر ہلکا گلابی لب اسٹیک لگایا تاکہ ہونٹوں پر چمک اُجائے اور وہ قدرتی رنگت لے ہوئے معلوم ہوں۔ پھر اس نے لوٹی کی خوشبو گردن اور شانوں سے لے کر کمر تک بکھیر دی۔ اس کے بعد اس نے طاؤسی ساڑھی پہن کر پیشانی پر سرے رنگ کی بندیا لگا کر جو اس نے اپنے حسن و جمال کا مشاہدہ کیا تو لانی گردن سے سینے کے اُبھار سے نیچے کر کی تیگنائے تک اسے وہ ہوش رہا جلوہ نظر آیا کہ وہ خود اپنے حسن سے چند لمحوں کے لئے مرعوب ہو گئی۔ اسے یقین سا آگیا کہ آج کی دعوت میں وہ پھر سب مردوں کی نگاہوں کا مرکز بنے گی۔ وہ عورت ہی کیا جو صرف اپنے مرد کی خاطر ہے۔ اپنا مرد تو گھاس ہے جس کو اونچی ایٹری اٹھا کر وہ روزِ روندتی ہے مزا تو تب ہے کہ جب منترِ سمیع اللہ کے دلکش ڈرائنگ روم کے سرے اور

یا توئی رنگ کے جھگکتے ہوئے فانوس کے نیچے گفتگو کرتے ہوئے مرد یکا یک چپ ہو جائیں اور ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہوئی حامدہ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں۔ محبت تو شادی شدہ زندگی کی چند روزہ علامت ہے۔ آگے یہ دیکھنا ہے کہ کون کس کو کہاں تک جلا سکتی ہے۔ آج بلاشبہ مسٹر مسیح اللہ کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی آدمی سے زیادہ عورتیں اس کی دشمن ہو جائیں گی۔ اس خیال سے حامدہ بے حد محظوظ ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر چکری لے کر آئینے میں اپنے آپ کو ہر زاویے سے دیکھا اور جب اپنے آپ کو ہر طرح سے کیل کانٹے سے درست پایا تو طاؤسی بروکیڈ کا پرس ہاتھ میں لے کر اپنے بیڈ روم سے آواز دیتی ہوئی نکلی۔

”ڈارلنگ تم تیار ہو؟“

ڈارلنگ جس کی گنجی کھوپڑی تھی اور مٹیالی رنگت تھی اور ذہنیت اس سے بھی زیادہ مٹیالی تھی اور جو سیلی دھاریوں والی بش شرٹ کے نیچے ہائل گرین رنگ کی طویل ڈھالی پتلون پہنے تھا۔ اپنا جیڑا کھیلتا ہوا آگے بڑھا۔ حامدہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ جیسے امیر کبیر عورتیں کتے کی زنجیر کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہیں اور بنگے کے دروازے سے باہر نکل گئی جدھر گاڑی کھڑی تھی۔

مگر بنگے سے نکلے ہی اسے اس پاس سے بھینی بھینی بدبو آئی۔ صرف خوشبو ہی بھینی بھینی نہیں ہوتی بدبو بھی بھینی بھینی ہوتی ہے۔ جیسے کہیں گھنے خجل میں نمدار گھاس کے اندر بہت سی کڑیاں، پتے اور ٹہنیاں ایک دوسرے کے بوجھ تلے دبی ہوئی آہستہ آہستہ گل رہی ہوں۔ ایک ہلکی سی سڑاندھ جیسے میتھیں گیس کی ہوتی ہے۔

حامدہ کے تنہنے نفرت سے کانپے۔  
 یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے؟ اس نے شوہر سے پوچھا۔  
 شوہر نے اپنی ناک پر ٹکے ہوئے دبیر شیشوں والی عینک کو ٹھیک کیا اور بنگلے  
 کے باہر کی موری کا معائنہ کیا۔

دس قدم چلنے کے بعد اسے سراغ مل گیا۔ کھلی موری کے موڑ پر ایک کتا مرا پڑا  
 تھا۔ موری کے اندر اس طرح ٹیڑھے انداز میں کہ اس کا سر تو بنگلے کے باغیچے میں کھڑے  
 کرسمس کے پیڑ کو دیکھ رہا تھا اور دھڑ سے لگی دم بنگلے کے دروازے کی طرف اشارہ  
 کر رہی تھی۔ بعض کتے مرتے ہوئے بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ انہیں کس طرف مرنا  
 ہے کتوں پر ہی کیا موقوف ہے آدمی کون سے بہتر ہیں؟

جانم موری میں ایک کتا مرا پڑا ہے شوہر نے ایسی قطعیت سے کہا جیسے وہ  
 شراک ہو مزہ ہو یا سراغ رسائی کے حکمے کا انسرا علی ہو۔  
 حامدہ ناک پر رومال رکھے آگے بڑھی مگر چند قدم جا کے رک گئی کیونکہ مرے ہوئے  
 کتوں کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ جوں جوں ان کے قریب جاؤ ان کی بدبو بڑھتی  
 جاتی ہے گو بعض لوگ اپنی زندگی ہی میں یہ خاصیت حاصل کر لیتے ہیں۔  
 حامدہ چیخ مار کے پٹی اور شعلہ بازنگا ہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے  
 بولی۔

دیکھ کیا رہے ہو، اسے فوراً یہاں سے ہٹوا کر دور بھینکوا دو۔  
 شوہر نے اپنے آپ کو اس گاڑی کی طرح محسوس کیا جس کی بیڑی ایک دم  
 ڈاؤن ہو جائے اس نے راہ چلتے دقتیں عزیمت نظر آنے والے آدمیوں کو کپڑا اگر کسی

نے حامی نہ بھری بلکہ جس آدمی کے کپڑے سب سے زیادہ میلے کچیلے تھے اس نے اسے بتایا کہ وہ ریگزیں کا سب سے بڑا بیوپاری ہے۔ اور شاہ گنج کے بازار میں اس کی سب سے بڑی دکان ہے اور سالانہ ڈھائی لاکھ انکم ٹیکس بھرتا ہے۔ اس کے بعد چند منٹ تک شوہر عجیب بے بس سا نظر آیا حالانکہ یہ صورت حال اس کے لئے کوئی نئی تو نہیں تھی اس نے آخر حجت کر کے راہ چلتے دو تین خوش پوش لوگوں سے پوچھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے ؟

ایک بولا : ”میاں جس کام پر جا رہے تھے سیدھے ناک کی سیدھا ادھر چلے جاؤ بس“

دوسرا بولا : ”اس کتے پر مٹی ڈالو اور اپنے آپ پر ڈی ڈی ٹی پھر ٹک لویا اپنے آپ پر مٹی ڈالو اور کتے پر ڈی ڈی ٹی یعنی جیسا موڈ ہو دیا کرو میں اس زندگی میں موڈ کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔“

”یسرے آدمی کو جس نے اسے روکا تھا کتے کا دود سے ملاحظہ فرما کر کہا :

بریڈ فورڈ، نسل کا اصل کوئی کتاب ہے، خریف النفس اور عجیب الطرائف، ضرور کسی اچھے گھر کا ہے اسے یہاں سے ہٹاؤ گے تو ضرور کسی مصیبت میں پھنس گئے بہتر یہی ہے کہ پولیس کو ٹیلیفون کر دو اس کے وارنٹین آگے خود لے جائیں گے۔ اچھی پولیس میں ٹیلیفون کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میونسپلٹی کے ڈاگ ڈیپارٹمنٹ کو فون کر دو وہ دین لاکر اٹھا کر لے جائیں گے۔ پانچویں آدمی اسے مشورہ دیا اور سیٹی بجاا ہوا آگے بڑھ گیا اس کے پُر اعتماد لیجے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ آدمی اپنے سوا باقی سب کو مشورہ دینے کا عادی ہے۔“



بوڈو ایک عرصے سے دور کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور نیم سرخ آنکھیں دھندلا رہی تھیں اس نے دورن سے کچھ نہیں کھایا تھا اس کے بیوی بچے بھی بھوکے تھے۔ چہرے پر پچھ دن کی داڑھی مٹی اور میلی پینٹ بائیں گھٹنے کے قریب سے گھسی کر پھٹ گئی تھی۔ اس وقت وہ گھر سے یہ عہد کر کے نکلا تھا کہ شاہ گنج بازار میں کسی زکسی کا لہو چھڑھو کے کچھ کھانے کا سامان لے کر آئے گا۔

میاں بیوی دونوں کو غیور دیکھ کر وہ اس وقت آگے بڑھا اور بولا۔ میں اس کتے کو یہاں سے ہٹا سکتا ہوں مگر بیس روپے لوں گا۔

پانچ روپے دے دیں گے۔ کیوں؟ میاں نے پر امید نگاہوں سے حامدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”پورے بیس لوں گا۔ بوڈو نے اطمینان سے کہا کیوں کہ وہ حامدہ کی بڑھتی ہوئی بے چینی دیکھ رہا تھا۔

ابھادس دے دیں گے حامدہ پرس سے دس کانوٹ نکال کر بھلاتی ہوئی بولی۔

”مگر اس کتے کو یہاں سے ہٹا کر دور کہیں پھینک دو۔“

بوڈو بولا۔ کیتھو تک جم خانے کی بغل میں جو میو نیپلی کے بے کا ڈھیر ہے۔

وہاں پھینک کر آؤں گا۔

حامدہ نے اپنے شوہر سے کہا۔ تم اس کے ساتھ جاؤ دیکھو وہاں تک پھینک

کے آتا ہے کہ نہیں۔ بعد میں اس کو دس روپے ملیں گے۔

مگر مجھے ایک رسی چاہیے بوڈو بولا۔ اس سڑے ہوئے کتے کو میں گود میں اٹھا

کر تو لے جا نہیں سکتا۔

بجلی میں سب کچھ تھا گر رسی نہیں تھی۔ سمجھ دار بیویاں آج کل گھر میں رسی نہیں رکھتی  
کہیں شوہر خود کشی نہ کر بیٹھے۔ ناچار دو چار پائجاموں، دو تین بیٹی کوٹ کے ازار بند نکالے گئے  
تو کام چلا۔ اب آگے آگے بوڑھے پیچھے پیچھے کتے کے پیچھے شوہر۔ اور شوہر کے  
پیچھے وہ میتھن گیس والی بدبو جس نے سارے محلے کو چونکا دیا تھا۔

اب بوڑھے کے پاس دس روپے تھے حالانکہ اس نے صرت دو یا تین روپے کی  
خواہش کی تھی جب ہاتھ میں دس روپے آگئے تو کتے کی ساری بدبو اس کے بدن سے  
نکل گئی اور شراب کی میٹھی میٹھی بلکوزے لیتی ہوئی خوشبو اس کے تن بدن پر چھانے  
لگی اس کی نیم سرخ آنکھوں کا ملکی غبار نارنجی امیدوں سے گہرا ہوتا گیا اور اس نے  
میدھے شراب خانے کی راہ لی۔ پانچ روپے کی وہ بوتل لے گا۔ دو روپے کی مٹھی  
تین روپے وہ گھر لے جائے گا۔ اپنے بیوی بچوں کے کھانے پینے کے لئے مگر  
ایسے بوتلوں پر جیسے کہ اکثر ہوتا ہے وہ دس روپے کی شراب پی گیا بلکہ ایک روپیہ  
اوپر سے ادھار رہ گیا۔

جیب جھاڑ کر جب بوڑھے شراب خانے سے باہر نکلا تو باہر کی تیز چلنے والی ٹھک  
ہوا میں اس کا نشہ ہرن سا ہونے لگا۔ اسے یہ اس نے کیا کر دیا؟ وہ یہ دس روپے  
اپنے گھر لے جاتا تو تین دن اس کے بیوی بچوں کا پیٹ بھرتا اس کے بجائے وہ  
اکیلے ہی دس روپے کی شراب پی گیا۔  
میشہ در شرابیوں کی طرح وہ دیر تک بے مقصد ٹہلتا رہتا اور اپنے آپ کو گایاں  
دیتا رہتا۔ یکایک وہ چلتے چلتے رک گیا اسے غوس ہوا کہ وہ اس وقت کیسے تک جھلے

کی گندگی کے سامنے کھڑا ہے اور وہ بدبو دار کتا اسی طرح اس ڈھیر پر پھیلا ہوا مرا پڑا ہے  
 یکا یک یوں کھڑے کھڑے اسے ایک عجیب ترکیب سوجھ گئی اس نے کتے کو بڑی  
 احتیاط سے اس گڑھیں لگے مختلف اوزار بند والی رسی سے کھینچا اور کھینچ کر راڈز ایونیو کے  
 ہمرڈولے مالی شان نیگلے کی ایک ایسی کھڑکی کے سامنے پھینک دیا جس کے پٹ سڑک  
 کی طرف کھلتے تھے۔

یہ نیگلہ اور اس کی یہ کھڑکی اس نے بڑی احتیاط سے انتخاب کی تھی۔ نیگلے کے اندر  
 کوئی پارٹی چل رہی تھی اور جس کھڑکی کے نیچے اس نے مرا ہوا کتا رکھا تھا اس کے اندر سے  
 مسرت بھرے تہنہوں کی ملی جلی مردانہ اور نسائی آوازیں آرہی تھیں بلاشبہ جو نہی مرے ہوئے  
 کتے کی بدبو اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے تھنوں میں بجائے گی وہ باہر جھانک کر دیکھیں گے  
 اور اسے سڑک پر چلتا ہوا دیکھ کر اسے بلا لیں گے اس بار وہ بیس سے کم نہیں لے گا۔ رات  
 گہری جا چکی ہے سڑک پر آمدورفت تقریباً ختم ہو چکی ہے اس وقت کوئی جمہار بھی نہیں مل  
 سکتا نہ فون کرنے پر میو نیسٹی سے کوئی دین آسکتی ہے۔ شاید اسے تیس روپے مل جائیں  
 اس وقت وہ سب لوگ اندر بیٹھے پی رہے تھے۔ یقیناً فراخ دلی سے کام لیں گے۔  
 وہ دیر تک اسی نیگلے کے آس پاس ٹہکتا رہا اندر سے برابر تہنہ سنانی دیتے رہے  
 مگر کسی کو کھڑکی سے باہر جھانکنے کا خیال نہ آیا رہی بدبو تو شراب کی بدبو اور مرے ہوئے  
 کتے کی بدبو میں کون سا ایسا زیادہ فرق ہے دونوں بدبو میں عناصر کو گلانے سڑانے کے بعد  
 پیدا ہوتی ہیں ان میں کسی قدر مماثلت کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔  
 جب دیر تک کسی نے ادھر توجہ نہ دی تو وہ بے چین ہو کر خود کھڑکی کے پاس گیا اور  
 بے حد نرم طریقے سے کھڑکی کو کھٹکھٹایا اور بے حد نرم لہجے میں بولا۔ "صاحب آپ کی

کھڑکی کے باہر ایک کتا مرا پڑا ہے۔

صاحب خانہ نے کھڑکی سے باہر بھاٹکا اور فضا کو سونگھا پھر بولے ”مرا پڑا ہے تو تمہیں کیا رتم اپنی راہ لو ہم صبح میونسپلٹی کو ٹیلیفون کر کے دین منگالے گا اور کتا ہٹوا دے گا جاؤ۔۔۔ اتنا کہہ کر صاحب خانہ نے کھڑکی اس زور سے بند کی گویا بدلو کے اندر آنے کے سارے راستے بند کر دیئے۔

بوڑھے نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا باقی سب بنگلوں میں اندھیرا تھا اور یہی اندھیرا اب اس کے دل میں چھا رہا تھا پھر سے سے ماؤنڈین میں جب اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اب اپنے بیوی بچوں کے لئے کچھ نہیں لے جاسکے گا تو وہ لڑکھڑا کر مرے ہوئے کتے کے پاس بیٹھ گیا اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔

## پہرہ

میں نے دیکھا ہے کہ قدرت ہر حال میں اپنا توازن برقرار رکھتی ہے ہم نے کام و  
موزہ، بخارا اور منونیا کے لئے پٹیلین ایجاد کی تو قدرت نے پٹیلین کو جھلک بنا دیا اب اتنے  
لوگ منونیا سے نہیں مرتے جتنے پٹیلین سے مرتے ہیں۔

ہم نے اربوں روپے خرچ کر کے عالمگیر میاں نے پٹیریا کو ختم کر دیا تو کینسر کا مرض وہابی  
صورت اختیار کر گیا۔ ہم نے تپ دق کا شافی علاج دریافت کر لیا تو دل کا عارضہ عام ہو گیا  
جسے دیکھنے اپنے سینے کے بائیں طرف ہاتھ رکھے متوجش نگاہوں سے ڈرا دسھا دکھائی دیتا  
ہے۔ میرے دوستوں میں ہر چوتھا دوست دل کا مریض ہے۔ پہلے دل کی بیماری میں صرف  
آہ و بکا کی جاتی تھی۔ اب جان بھی جاتی ہے۔

دل کا عارضہ رنج و غم کرنے سے بڑھتا ہے۔ اسی لئے ساری دنیا کے مارٹ اسٹینٹ  
یہی کہتے ہیں کہ اگر دل کے مارنے سے محفوظ رہنا چاہتے ہو اور لمبی عمر پانا چاہتے ہو تو رنج و غم



کو کبھی اپنے قریب نہ ٹھکنے دور ہمیشہ خوش رہا کہ اس لئے اب میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔  
گزشتہ سال میرے والد کا انتقال ہو گیا تو میں برابر مسکراتا رہتا۔ احباب تعزیت کو آتے  
رہے مگر میں مسکراتا رہا نہ جانے انہوں نے کیا سمجھا مگر میں تو ڈاکٹر کے کہنے پر عمل کر رہا تھا۔  
پھر چھ ماہ بعد میری خالہ محترمہ کا انتقال ہوا تو میں خوش رہنے کے لئے ایک کچر اڈس میں  
ایک عربیہ فلم دیکھنے چلا گیا۔ پرسوں میرے گھر میں آگ لگ گئی تو میں خوشی سے قہقہے لگانے  
لگا۔ میری بیوی نے سمجھا شاید میں پاگل ہو چکا ہوں مگر جب میں نے اسے سمجھایا کہ میں پاگل  
نہیں ہوں محض خوش ہوں اور خوش بھی اس لئے ہوں کہ اس سے عمر بڑھتی ہے تو اس  
نے پاگل خانے لے جانے والی ایمبولینس واپس کر دی مگر میں دیکھ رہا تھا وہ ایمبولینس واپس  
کر دینے پر کچھ خوش نظر نہیں آتی۔

نکر کو دور رکھنے اور دل کو ہمیشہ خوش رکھنے کے علاوہ آج کل ڈاکٹر لوگ اور خصوصاً  
مارٹ اسپیشلسٹ دل کی بیماری کے مریضوں یا ہونے والے مریضوں کو وزن گھٹانے  
کا مشورہ بھی دیتے ہیں ڈاکٹروں کی رائے میں طویل عمر پانے کا ایک ہی نسخہ ہے، اپنا وزن  
گھٹا دو! مجھے اس دلیل میں وزن نظر آتا ہے۔ کیونکہ میں نے سنا ہے، جنوں ییلے کے مرجانے  
کے بعد بھی پچھتر برس زندہ رہا، میں نے سنا ہے اور فلموں میں بھی دیکھا ہے کہ اس کا وزن  
اتنا کم تھا کہ جب اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو اس کے دوست اور احباب  
محض ایک پھونک مار کر اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتے تھے۔  
ایک بار زور کی پھونک لگ جانے سے وہ اپنی منزل سے کچھ دور دریا میں گر پڑا مگر  
دوب نہ سکا کیونکہ اس کا وزن پانی سے کم تھا۔ پھر ایک ٹیبل نے پھونک ماری اور وہ واپس  
اپنے احباب کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا گریبان ہمیشہ چاک رہتا تھا کیونکہ اس کا تن ناتواں

کپڑوں کا بوجھ نہ سہا سکتا تھا۔ لیلی کے مرنے کے بعد مجنوں نے کئی بار مرنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہا۔ وہ نہ سکا نہ ہر کھایا تو نہ ہر سیال بن کر اس کے جسم سے نکل گیا۔ اس لئے کہ زہر کا وزن مجنوں کے وزن سے زیادہ تھا ایک بار مجنوں نے ایک کانٹے سے ایک پتلا دھاگا لٹکا کر پھانسی لگے میں لگا کر مر جانے کی سوچی۔ دس سال تک وہ اس دھاگے سے بندھا کانٹے سے لٹک رہا مگر اس کی جان نہ نکلی کیونکہ اس کا وزن دھلگے اور کانٹے دونوں سے کم تھا پھر ایک دن ایک رطبت نے اس دھلگے کو پھلی پکڑنے کا دھاگا سمجھ کر پانی میں لٹکا دیا جہاں مجنوں کو ایک پھلی نے نکل لیا لیکن وہ اسے بھنم نہ کر سکی کیونکہ بھنم کرنے کے لئے وزن چاہیئے اس لئے مجنوں پھر پانی کی سطح پر اگل دیا گیا لوگ بھاگ کہتے ہیں مگر میں نہیں جانتا۔ خدا جانتے کہاں تک پہنچے مگر سبھی دیوانے اور فرزانے بھی کہتے ہیں کہ مجنوں آج بھی زندہ ہے۔ کچھ لوگوں کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا ہے اس کہانی میں اور کوئی صداقت ہونہ ہو۔ اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ آدمی وزن گھٹانے سے دل کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ دوسرے عوارض اس پر اس لئے حملہ نہیں کرتے کہ انہیں حملہ کر کے ملے گا کیا؟ اس لئے درزائی عمر کی دعا کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنا وزن گھٹایا جائے۔

وزن گھٹانے سے پہلے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ وزن بڑھتا کیسے ہے پہلے یہ خیال عام تھا کہ وزن آپ ہی آپ بڑھتا ہے اور بچپن سے بڑھاپے تک ایک خاص مقدار اور رفتار سے بڑھتا ہے۔ پہلے یہ خیال عام تھا اب یہ خیال غامض ہے اب ڈاکٹروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وزن خود بخود نہیں بڑھتا۔ زیادہ اور نگدہ کھانوں سے بڑھتا ہے جس گھر میں اچھا باورچی یا اچھا کھانا پکانے والی بیوی ہوگی۔ اس گھر کے مالک کو دل کا عارضہ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے یہ لازم ہے کہ اگر آپ دل کے عارضہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے تو

ایسا یاد رہی یا بیوی لائیے جو کھانا پکانا نہ جانتی ہو۔ اس لئے آج کل طلاق عام ہو رہی ہے اور چھوٹے بیویوں کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔ اور اچھا کھانا پکانا اور اصلی گھی استعمال کر کے اپنے شوہر کو کھلاتا بیویوں کی خامیوں اور نقائص میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ پرسوں میں نے اخبار میں ایک مقدمے کی روداد پڑھی جس میں شوہر نے اپنی بیوی پر زبردستی کا الزام لگایا تھا تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ بیوی اپنے شوہر کو اصلی گھی میں کھڑے مصلے کا تورہ تیار کر کے کھلاتی تھی! عدالت نے مجرم کو چھ سال قید! مشقت کی سزا دی ہے۔ کیونکہ طرزِ مزہ اپنے شوہر کو اصلی گھی ہی نہیں کھلاتی تھی صبح ناشتہ میں ایک گلاس اصلی دودھ بھی زبردستی پلاتی تھی تاکہ اس کے شوہر کا وزن بڑھ جائے اور وہ وزن بڑھنے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر جلدی مر جائے لیکن آج کل کے جج عاقل اور دانش مند ہوتے جا رہے ہیں پہلے پوسٹ مارٹم پر ڈاکٹروں کی رائے طلب کی جاتی تھی۔ اب سنا ہے کہ عدالت فیصلہ منانے سے پہلے اس قسم کا وزن بڑھانے والے کیس پر ڈاکٹری رائے بھی لیتی ہے اور اسے ناطق سمجھا جاتا ہے سنا ہے کہ آل انڈیا میڈیکل ایسوسی ایشن نے ایک ایسی تجویز حکومت کے سامنے رکھی ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کو اصلی گھی کھلائے۔ اصلی دودھ پلائے اور مرغن کھانے کھلائے اسے فوراً پھانسی دے دی جائے! لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ وزن صرف اصلی گھی کھانے اور اصلی دودھ پینے اور گوشت کے مرغن کھانوں ہی سے نہیں بڑھتا وزن دراصل فزائیں نشاستہ کی زیادتی سے بڑھتا ہے اور نشاستہ آلو میں سب سے زیادہ ہوتا ہے جوں جوں لوگ آلو زیادہ کھاتے جاتے ہیں وزن میں بھالو بیٹے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر وزن کم کرنا ہے تو آلو مت کھائیے۔ نشاستہ روٹی میں بھی ہوتا ہے اور ڈیل روٹی میں تو اصلی روٹی سے بھی ڈیل ہوتا ہے اس لئے اسے ڈیل روٹی کہا جاتا ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے

روٹی سے اجتناب کیجئے۔ پہلے زمانے میں لوگ روزی روٹی کے لئے ٹیگ دود کرتے تھے اور دونوں کو حاصل کر کے موٹے ہو کر مر جاتے تھے اب صرف روزی کے لئے ٹیگ دود کیجئے اور روٹی کو بالکل ہی بھول جائیئے۔ نشاستہ اس لئے بھی برا ہے کہ یہ انسان کے جسم میں جا کر ایک کیمیاوی عمل سے شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے شکر کی زیادتی سے ذیابیطس ہوتی ہے جس سے اکثر قلب کا دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ نشاستہ انسان کے جسم میں پہنچ کر اس قدر ناشائستہ ہو گا اس کا مجھے علم نہ تھا آج سے چائے میں شکر بند، مٹھائی بھی بند اور سائیکل بھی ختم۔

پروٹین بھی انسان کو موٹا کرتی ہے کیونکہ اس میں وہ اجزا ہوتے ہیں جو گوشت بناتے ہیں۔ اس لئے زندہ رہنے کے لئے پروٹین کو بھی کم کرنا ہو گا، گندم میں پروٹین ہوتی ہے سرخ گوشت میں پروٹین ہوتی ہے۔ سفید گوشت میں البتہ پروٹین کم ہوتی ہے۔ جیسے مرغی کا گوشت یا مچھلی آج کل اچھی مرغی آٹھ روپے سے کم میں نہیں آتی اس لئے اگر آپ کی تنخواہ دو سو پچاس روپے ہے تو اس میں سے دو سو چالیس روپے مرغی پر صرف کیجئے اور دس روپے ہر ماہ بچا لیجئے اور جناب چھینے میں دس روپے کی بچت کچھ کم نہیں ہوتی فرض کیجئے کہ آپ اس طرح سو سال زندہ رہیں اور ہر ماہ دس روپے بچاتے رہیں تو ذرا سوچتے کہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کے کتنے رشتے داروں کا بھلا ہو گا۔

گٹھیا بھی دل کا دشمن ہے گٹھیا کا مارتھ میں جوڑوں میں درد ہوتا ہے اور وہ سوج جاتے ہیں یہ ابتداء ہے دل کے دورے کی اور گٹھیا یورک ایسڈ کی زیادتی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی جسم کا اندرونی نظام جسے انگریزی میں مٹابولزم کہتے ہیں۔ آپ ہی آپ یورک ایسڈ زیادہ پیدا کرتا ہے۔ وہ ہیں والیں، مٹر، پھلیاں، سرخ گوشت وغیرہ یاد رکھئے کہ آپ شکر بند کر چکے



ہیں۔ دودھ مکھن آپ پر حرام ہے اب سب طرح کی دالیں مع مٹر بند ہو چکیں تو پھر آپ کیا کھائیں گے! غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام اور اطمینان سے سوئے کہ غم کھانے سے بھی عمر کم ہوتی ہے اور آپ لمبی عمر پانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ آپ دن کو لوکی کھائیے اور رات پالک کا ساگ اور اصلی گھی کی جگہ سورج مکھی کے بیجوں کا تیل استعمال کیجئے۔ بہتر یہ ہو گا کہ سورج کو بھی چھوڑ دیجئے صرف مکھی کا تیل استعمال کیجئے۔ دن کو لوکی رات کو ساگ اسے میری موت دور بھاگ اور اگر آپ کو لوکی اور پالک کے ساگ اور سورج مکھی کے بیج کے تیل سے نفرت ہے تو صرف پانی پیجئے اس میں تھوڑا سا شکرے کا رس ملا لیجئے دل کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اس لئے نمک بھی مت ملائیے۔ اس کی جگہ شکرے کا رس پانی میں ڈال کر ریجئے ہر اکیس دن کے فاصلے کے بعد گاندھی جی یہی کیا کرتے تھے۔ پانی اور شکرے کا رس بس!

لمبی عمر پانے کا مجھے بھی بچپن سے شوق رہا ہے اور اچھے کھانے کا بھی بچپن سے شوق رہا ہے لیکن دونوں شوق ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے اس لئے میں نے وزن گھٹانے کے لئے ناشتہ بند کر دیا اور وہ تمام روٹیاں اور سبزیاں بھی جن میں ناشتہ ہوتا ہے، پھر میں نے مٹھائی کھانا بند کیا۔ آئس کریم کو چھوٹے سے انکار کیا۔ سرخ گوشت سے پرہیز۔ آلو مٹر۔ پھل والی بھاجی۔ آہستہ آہستہ خوراک کم کرتے کرتے میں صرف پانی اور دو چمچے اور بیج جو اس پر آگیا۔

وہ جیتے اس خوراک پر کسی نہ کسی طرح زندہ رہ کر جب میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے وزن تولنے والی مشین پر لا کھڑا کیا تو معلوم ہوا اس پر میز کے بعد بھی میرا وزن دس پونڈ بڑھ چکا تھا۔



ڈاکٹر کے چہرے پر ایک خطرناک سنجیدگی کی ہیرائی رشتہ کوپ کو میرے دل پر رکھتے ہوئے بولا: کیا کھاتے رہتے ہو؟

میں نے کہا: پانی میں تھوڑا سا اور سبج جو س ڈال کر پیتا رہا ہوں۔  
 "یہی تو خرابی ہے تم میں۔ ڈاکٹر میرے سینے کو اپنے انگوٹھے سے ٹھونکتے ہوئے بولا: وزن بڑھ گیا ہے۔ سنگترے کے رس میں بڑے قوی اجزا ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں تم صرف پانی پیو۔ ایک ہفتے میں تمہارا وزن کم ہو جائے گا۔ موجودہ حالت اور صحت بے حد خطرناک ہے تمہیں کسی وقت بھی دل کا دورہ پڑ سکتا ہے۔ اگلے ہفتے آنا۔"

گھر آکر میں نے بیوی سے کہا کہ آئندہ سے میں صرف پانی پیا کروں گا اور محض پانی پی کر جیا کروں گا۔ صبح ناشتے میں ایک کپ پانی۔ پنج پر ایک گلاس پانی۔ رات کو دو گلاس پانی ایک ہفتے میں وزن آپ ہی آپ کم ہو جائے گا۔ بیوی نے بھی خوش ہو کر اس پر صاف کیا۔ کیونکہ اس طریقے پر عمل کرنے سے کچن کا خرچ بہت کم ہو گیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد جب میں پھر ڈاکٹر کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ محض پانی پینے سے میرا وزن دو پونڈ اور بڑھ چکا ہے۔ ڈاکٹر حیرت میں پڑ گیا بولا: تم نے کچھ اور تو نہیں کھایا یا پیا صبح بتاؤ۔

"مطلق نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ فون کر کے میری بیوی سے پوچھ سکتے ہیں۔  
 پانی پینے کا گلاس صاف تھرا تھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں سوڈے سے دھوا دیا تھا۔ میں نے کہا ہمیشہ دھلاتا ہوں اور اپنے سامنے تل کا پانی نکھڑا کر پیتا ہوں۔"

"پھر وزن کیوں بڑھ گیا؟ ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔"

میں نے کہا کہ جب آپ جانتے ہیں بمبئی کے پانی میں پانی کے سوا سب کچھ ہوتا ہے  
نل کھولنے تو کبھی پانی کی پتلی دھار کے ساتھ پھیلی چلی آرہی ہے۔ کبھی گھونگھے، کبھی چوہے۔  
کبھی کیکرٹے، ایسی ایسی مقورات پائی جاتی ہیں کہ آدمی اگر اس پانی کو پئے تو ناممکن ہے  
کہ موٹا نہ ہو۔

تو آئندہ سے پانی چھان کر پیجئے۔ ڈاکٹر نے بڑی سختی سے کہا سولہ روپے نکالو میری ٹیس کے  
میں نے سولہ روپے حبیب سے نکال کے ڈاکٹر کی ہتھیلی پر رکھے اور گھر چلا آیا اور گھر آکر  
بیوی سے کہا کہ وہ میرے لئے ٹکڑے مصالحے کا گوشت تیار کرے۔ چکن، ریٹنی کباب، میٹر  
کے تیکے، قیسے بھرے پرائے اور آخر میں ایک پاؤ آئس کریم، رات کو سونے سے پہلے بالائی دلے  
دودھ کا ایک گلاس بھرا ہوا جس میں بادام اور کشمش اور چھوٹے بھرے بھی پڑے ہوں۔

بیوی نے گھبرا کر کہا: تمہارا کیا ارادہ ہے اپنی جان دینے کا؟ بارہ پونڈ وزن تمہارا پہلے  
سے بڑھ چکا ہے اب صرف چھنا ہوا پانی پیو بلکہ ابال کر پیو۔ میں نے کہا مرنا تو ہر حال میں ہے  
میں جیسے کہتا ہوں ویسے کرو۔ دوسرے دن میں نے اس سے کہا آج کے مینو میں تندوری  
مرحہ تلی ہوئی پام فریٹ، چکن بریانی اور لہسن سے بگھارا ہوا دہی کا زائیدہ اور آلو کے پرائے  
اور بعد میں بنارس سلوائی والے کے ہاں سے موہن مہوگ کی ایک پلیٹ ادھر کھانے میں  
اصلی گھی استعمال ہو۔ درخت تازہ مکھن، سات دن میں نے اسی طرح کا پرسیر رکھا اور خوب  
ڈٹ کر کھایا بیوی مسلسل احتجاج کرتی رہی اس نے اپنے میکے والوں کو خط لکھ دیا کہ وہ جلد  
کوئی بری خبر سننے کے لئے تیار رہیں اور میرے تمام دوستوں کو خبردار کر دیا کہ انہوں نے  
مجھے جو قرضے دے رکھے ہیں وہ جلد سے جلد اس کا چکنا کر لیں ورنہ بعد میں وہ اس کی زمرہ دار  
نہ ہوگی۔

سات دن مرغن قدائیں کھانے کے بعد جب میں نے ڈاکٹر کے کہنے پر وزن تولنے والی مشین پر پاؤں رکھا تو میرا وزن بارہ پونڈ کم ہو گیا تھا۔ یہ سب ڈاکٹر کے چہرے پر ایک مطمئن تبسم نظر آیا۔ میں کہتا نہ تھا۔ موٹا کرنے والی وزن بڑھانے والی تمام اشیاء چھوڑ دو۔ تمہارا وزن خود بخود کم ہو جائے گا۔ دیکھا آج وزن بارہ پونڈ کم ہے اور چہرے پر بھی رونق ہے جو احتیاط، پرہیز اور ڈاکٹر کا کہا ماننے سے آتی ہے۔ نکالو تبس ریڑی

# ہاتھ کی چوری

سویرے جوکل میری آنکھ کھلی، تو دیکھتا ہوں کہ میرا بایاں ہات غائب ہے۔ ہات کو جب سویاتھا تو موجود تھا۔ بہت حیران ہوا، کہاں غائب ہو گیا ہے۔ بستر پر ادھر ادھر ڈھونڈا کہیں نہ ملا۔ کہنی ردائیں کہنی، مارکر بیوی کو جگایا۔ اس سے پوچھا: ”بھلی مانس تم نے کہیں میرا بایاں ہاتھ دیکھا ہے؟“ وہ بوٹی کیا دایاں، کیا بایاں۔ ہات تو تمہارے میں ایسے ایسے دیکھ چکی ہوں کہ اب تمہارے سارے ہتھکنڈوں سے واقف ہو چکی ہوں۔ اس وقت تم کون سے ہات کی صفائی دکھا رہے ہو؟“

میں نے کہا: ”نیک بخت، میں ہات کی صفائی کیا دکھاؤں گا؟ میرا خود ہات غائب ہے۔ یقین نہ آئے تو خود دیکھ لو!“

اس پر چونک کر اٹھ بیٹھی۔ میرا بایاں شانہ ٹھول کر کہنے لگی۔

”واقعی غائب ہے ایسے لگتا ہے جیسے کبھی تھا ہی نہیں!“

پھر میری طرف شب بھری نظر سے تاکتے ہوئے بولی: ”کس کو دے آئے ہو؟“

”اری کس کو دیتا، اور کون لیتا ہے بات۔ اور وہ بھی بایاں!“

”تم نے مزدور کسی کے ہات میں ہات دیا ہوگا۔ اور وہ زنگین چڑیا، آفت کی پڑیا اسے لے کے

چل دی ہوگی۔ یا تم نے کسی کی کمر میں ہات ڈالا ہوگا اور لٹکانا بھول گئے ہو گے!“

”میدم یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ دیکھتی نہیں ہو میرا بایاں ہات غائب ہے۔!“

”تو میں کیا کروں؟“ وہ ایک جھانی لے کر بولی ”ڈھونڈو، کہیں ادھر ادھر رکھ کے بھول گئے

ہو گے، تمہاری پرانی عادت ہے، چیزیں ادھر ادھر رکھ کے بھول جاتے ہو۔“

سارا گھر چھان مارا، پتلون کی دونوں جیبیں دیکھ ڈالیں، غسل خانے کا ٹوٹا تک دیکھ ڈالا۔

نوکر کو ڈانٹ ڈپٹ کر پوچھا۔

”تو نے میرا بایاں ہات تو نہیں لیا؟ سچ سچ بتا، نہیں تو ابھی ایک ہاتھ دوں گا۔!“

وہ بے چارہ گھبرا کر بولا: ”حضور، میں آپ کا ہات لے کر کیا کروں گا۔ میرے دونوں ہات

پیلے سے موجود ہیں، دیکھ لیجئے۔!“

واقعی بات تو ٹھیک ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ موجود تھے۔ پھر وہ تیسرا ہاتھ لے کر کیا

کرتا اور جسم کے کس حصے پر لگاتا؟ میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اور سڑک

پر مہولیا۔ جہاں میں رات کا کھانا کھانے کے بعد سیر کے لئے جاتا ہوں۔

میری پرانی عادت ہے کہ چلتے وقت دونوں ہات جھٹلا کر چلتا ہوں، لیکن ہے رات کو

سیر کرتے وقت بایاں ہات دراز دراز سے جھٹلا دیا ہوا اور وہ بے چارہ میرے سے ٹٹلنے سے کھسک

کر کسی گڑھے میں گر پڑا ہوا!



سڑک کے کنارے سارے گڑھے دیکھ لئے۔ بات کہیں نہیں ملا۔ بیٹے کی دکان پر گیا جو  
نکڑ پر واقع تھی اور جہاں سے میں نے رات کو گھر جاتے ہوئے رُک کر کچھ ضروری سودا سلف  
خریدا تھا!

بنیامیری بات سن کر دونوں بات جوڑ کر بولا "تاں باباجی، ہم کسی کا پرایا بات نہیں  
رکھتے۔ رام رام۔ ایسا بڑا کام ہم کبھی نہیں کرتے!"

"اے مٹھول، تمہاری تو پرانی عادت ہے، رام رام چینا اور پرایا مال اپنا، نکال میرا  
بایاں بات....!"

"نہیں بابو جی، ہم نے آپ کا بایاں ہاتھ نہیں دیکھا۔ ہماری دکان پر اگر کوئی گاہک اپنی  
چیز بھول جادے تو ہم اسے سنبھال کر رکھیں ہیں ایک دفعہ ایک گاہک برسات کے زمانے  
میں اپنی چھتری بھول گیا تھا۔ اگلی برسات کو ہم نے اس کی چھتری واپس کر دی۔ اب چھتری تو  
بھلا کام کی چیز ہے۔ آپ کا بایاں بات کس کام کا۔"

تھک ہار کر میں پولیس میں جانے والا تھا۔ پھر بیٹے کی بات یاد آگئی۔ واقعی بایاں بات  
کس کام کا....؟ سارا کام تو میں دائیں بات سے کرتا ہوں۔ لگتا دائیں بات سے ہوں۔ لڑتا  
دائیں بات سے ہوں۔ اور آداب کرتا دائیں بات سے ہوں ایک بات جوڑنے کے وقت  
دونوں بات کام آتے ہیں چلو اچھا ہوا، بائیں بات کے غائب ہونے سے بار بار بات جوڑنے  
کی خوشادانہ عادت چھوٹ جائے گی۔ بائیں بات کا کون سا ایسا کام ہے جو میں دائیں بات سے  
نہیں کر سکتا؟ پھر پولیس میں رپٹ ہوگی تو طرح طرح کے سوال پوچھے جائیں گے۔ تمہارا نام کیا  
ہے، باپ کا نام کیا ہے۔ دادا کا نام کیا تھا؟ کس وقت چوری ہوئی؟ کہاں پر چوری ہوئی؟  
تمہارے پاس اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارا کبھی بایاں بات بھی تھا؟ اگر رات کو سوتے وقت

تمہارا بایاں بات گم ہوا تو بیوی کی شہادت درکار ہے۔ اُسے جھانے میں پیش کر دو۔ ممکن ہے تمہاری بیوی نے تمہارا بات چرا کر اپنے بینک لاکر میں بند کر دیا ہو؟ ورنہ بیوی کی نیک چلنی کی ضمانت پیش کر دو۔ ممکن ہے تم نے خود ہی اپنا بات غائب کر دیا ہو۔ آج کل ایسے قصے بہت سننے میں آتے ہیں کہ خود ہی چیز غائب کر دی اور چوری کا الزام دوسرے پر مقبوظ دیا۔ ممکن ہے اس بایں بات سے تم نے کوئی لمبا بات مارا ہو، اور اب پکڑے جانے کے ڈر سے خود ہی غائب کر دیا ہو۔ کس رنگ کا بات ہے؟ کتنا لمبا بات ہے؟ کتنی انگلیاں تھیں؟ اگر پانچ تھیں تو کیا پانچوں کی پانچوں گھسی میں تھیں؟ اور اگر پانچوں انگلیاں گھسی میں تھیں تو سر کہاں پر تھا؟ تفصیل سے بیان کر دو۔۔۔۔۔

غرضیکہ میں نے پولیس میں رپورٹ کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ چند دنوں تک سڑک پر ہر آتے جاتے کو بڑے غور سے دیکھتا رہا کہ کہیں کوئی تین بات والا آدمی ملے تو اسے فوراً پکڑ کر دہلیج لوں مگر شومی قسمت سے کوئی تین بات والا آدمی نہ ملا۔ ایسے تو کئی ملے، جن کا ایک بات میری طرح غائب ہو چکا تھا۔ آخر کار ایک ہی بات پر صبر کر لیا۔ کچھ دنوں بعد دوسرے بات کی کمی کا احساس بھی جاتا رہا۔ کیونکہ بایاں بات تھا، جو اکثر مجھے بیکار اور فاضل عضو معلوم ہوا۔ کبھی کبھی تو اس سے حد درجہ رقابت محسوس ہوتی۔ مثلاً آپ اپنی محبوبہ کی کلر میں اپنا دایاں بات ڈالے چل رہے ہیں تو آپ کے ساتھ ساتھ آپ کا بایاں بات بالکل ایک تیسرے اور اجنبی آدمی کی طرح چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے، جس سے آپ پیچھا بھی نہیں چھڑا سکتے۔ اچھا ہوا کجخت خود ہی کہیں غائب ہو گیا۔ چند ماہ کے بعد میں یہ تک بھول گیا کہ میرا کبھی کوئی دوسرا بات بھی تھا۔ پھر ایک دن میرا ایک کان غائب ہو گیا اس دن بھی سو کے اٹھا ہی تھا، اور منہ پر بات بھر رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرا ایک کان غائب ہے۔ دو تین بار چہرے پر بات پھیر کے دیکھا فی میرا دایاں کان غائب تھا اور جہاں اُسے ہونا چاہیے وہاں جلد بالکل صاف اور سیاٹ تھی۔

جیسے کبھی نہیاں کوئی کان تھا ہی نہیں۔ جلدی سے بستر سے اٹھ کے آئینے کے سامنے گیا، واقعی  
میرا دایاں کان غائب تھا۔

چند لمحے عجیب سکتے اور حیرت کے عالم میں گزرے۔ کہاں گیا میرا کان؟ تکیے اٹھا کے دیکھا  
کھاٹ کو اٹھا کے جھاڑا۔ شور سن کر بیوی جاگ گئی۔ "سوئے نہیں دو گے، اب کیا افتاد پڑی"  
وہ آنکھیں بند کئے غنودگی بھرے لمبے میں بولی۔

"میرا دایاں کان غائب ہے؟"  
"ارے کہاں غائب ہے۔ تمہارے توشیلان کے سے کان ہیں، یہ کیسے غائب ہو سکتے  
ہیں بھلا؟"

"نہیں غور سے دیکھو، نیک بخت۔ واقعی ایک کان غائب ہے؟"  
"ارے تم تو سنی اُن سنی کر دیتے ہو، ایک کان سے سنتے ہو، دوسرے سے اڑا دیتے ہو، میں  
تمہیں کیا جانتی نہیں ہوں۔ کان غائب ہے۔ تمہارے کان تو ہر وقت غائب رہتے ہیں؟"  
"آنکھیں کھول کے دیکھو پیاری، واقعی میرا دایاں کان غائب ہے؟"

اب کے وہ بہت چکرائی، سینے پر دو ہتھ مار کر بولی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے ہو لے ہو لے تم اپنی  
ساری چیزیں گم کر رہے ہو۔ پہلے ہات گیا، اب کان گیا۔ کل کو ٹانگ جلے گی، پرہوں دھڑ،  
میں تو سمجھتی ہوں۔ تم ہو لے ہو لے جان بوجھ کر اپنے آپ کو DISMAKE کر رہے ہو۔ ایک  
دن تم گھر سے غائب ہو جاؤ گے اور کسی دوسری ہوتی سوتی کا گھر آباد کر دو گے۔ کسی کو  
کانوں کان خبر نہ ہوگی؟ میں تمہارے سب چلتر جانتی ہوں؟"

اس دفعہ سب یادوں و دستوں نے صلاح دی ہے کہ مجھے مزور پولیس میں جانا چاہیے اور  
اس عجیب و غریب چوری کی واردات کی رپورٹ لکھوانی چاہیے۔ بہت غور و غور کے بعد میں

نے پولیس میں رپورٹ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ آخر کوئی اتنا بڑا نقصان تو نہیں ہوا میرا۔ ایک کان چلا گیا تو کیا ہوا۔ دوسرا تو موجود ہے۔ کام کی بات تو اس سے بھی سنی جاسکتی ہے اور بے کار باتیں سننے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے اور اب ایک کان بھی نہیں ہے تو اب بیوی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ تم اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیتے ہو۔ کیونکہ دوسرا کان موجود نہ ہونے کی صورت میں۔ ایسی شکایت نہیں کر سکتی۔ پھر صرف ایک کان ہونے پر دنیا کا شور بھی آدھا ہو جائے گا۔ اور پھر اس صنعت زدہ مشینی زندگی میں شور اس قدر ہے کہ اس شور سے زندگی آدھی ہو جاتی ہے لہذا ایک کان ہونے سے میری زندگی بڑھ جانے کی صلاحیت بڑھ سکتی ہے چنانچہ اس امر پر جتنا زیادہ غور کیا، ایک کان کو اپنے لئے درد کانوں سے زیادہ مفید پایا۔ لہذا پولیس میں جانے کا خیال ترک کیا۔!

چند ماہ بڑے سکون اور اطمینان سے گزرے۔ پھر ایک دن میری ایک آنکھ غائب ہو گئی۔ ہوا یہ کہ میں اپنے مطالعے کے کمرے میں آرام گرسی پر بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کتاب بے حد دلچسپ تھی اور موضوع دقیق، لہذا چند صفحے پڑھنے کے بعد میں کرسی پر بیٹھا بیٹھا سو گیا۔ جب جاگا تو معلوم ہوا کہ سہ پہر ڈھل چکی ہے اور شام آچلی ہے۔ میں نے آنکھ کو جلدی سے کمرے میں روشنی کی۔ غسل خانے میں گھس کر ہاتھ منہ دھویا۔ منہ ہات دھوتے دھوتے لیک ایک میری آنکھوں نے محسوس کیا کہ میرے چہرے سے میری ایک آنکھ غائب ہے۔ گھبرا کر اور سر اٹھا کر میں نے سانس کی دیوار گیر آئینے میں دیکھا۔ واقعی بائیں ابرو کے نیچے جہاں آنکھ کو ہونا چاہیے تھا۔ وہاں سے آنکھ غائب تھی۔ وہاں نہ چوڑے رہے نہ پلکیں، نہ پتلی، صاف شفاف جلد تھی اور کچھ نہیں۔ بار بار آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، دوسری آنکھ نظر نہ آئی، جیسے کبھی تھی ہی نہیں چہرے پر یہ بات نہ لگتی تھی۔

”یہ کیا ہوا؟ دماغ چند لمحوں کے لئے بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا۔ جب ہوش میں آیا تو میں

نے زدر کی ایک چیخ ماری!

میری چیخ سن کر میری بیوی دوڑی دوڑی غسل خانے میں گھس آئی۔ بولی ”کیا ہوا؟ آنکھ

میں صابن پڑ گیا؟“

”نہیں میری ایک آنکھ غائب ہے!“

”کون سی؟“

”بائیں!“

ایک لمحہ کے توقف کے بعد وہ بولی۔ ”خود رقم نے کسی پر بُری نظر ڈالی ہوگی!“

”ڈارلنگ“

”یا کسی سرافذ سے آنکھیں چار کی ہوں گی....!“

”آف۔۔۔!“

”یا کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا ہوگا۔ کہیں آنکھ ملانی ہوگی اور وہ پھنسا

اچک کے لئے گئی ہوگی!“

میں نے بیوی سے مزید پوچھنا چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس کی تو ایک ہی رٹ

ہے اس لئے میں نے اپنی کتاب کا ایک ایک ورق پھان مارا۔ کرسی کے نیچے دیکھ لیا۔

بینک کے چرمی خول کو ٹٹول ٹٹول کے دیکھ لیا۔ کئی دن تک دوسرے دوستوں کے گھر میں

میں اپنی آنکھ ڈھونڈتا رہا۔ مگر آنکھ کہیں نہ ملی۔ اگر کسی نے چرائی بھی ہوگی تو کوئی واپس دینے

کے لئے تیار نہ تھا۔ میں بزنس میں ہوں میں سمجھ سکتا ہوں۔ آج کل لوگوں کی آنکھ کا پانی مر

گیا ہے۔ مردت نام کی کوئی شے نہیں رہی۔ مثل مشہور ہے، ماسے گھٹنا۔ پھوٹے آنکھ....



مگر میں نے تو کہیں گھٹنا بھی نہیں مارا.... پھر آنکھ کدھر غائب ہو گئی؟

اس دفعہ تو بیوی نے بھی پولیس میں جانے کی صلاح دی۔ مگر عقل نے اس کے خلاف رائے دی۔ دیکھیے ایک تو میں معروف بزنس میں ہوں کام دھندا آتنا پھیلا رکھا ہے کہ اس چھوٹی سی چیز کی گمشدگی کی رپورٹ کرنے پر میرا جو وقت صرف ہو گا وہ میں کسی بہتر دھندا میں صرف کر سکتا ہوں ٹھیک ہے ایک آنکھ گئی مگر دوسری موجود ہے اور ایک آنکھ کے جانے سے دوسری آنکھ کی بینائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ دونوں آنکھ کے برابر معلوم ہوتی ہے اسے فطرت میں ۷۵% OF COMPENSATION کہتے ہیں۔ پھر ایک آنکھ رکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ اب ساری دنیا کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ یعنی تقریباً تقریباً سوئٹسٹ محسوس کرتا ہوں ایک آنکھ کے چلے جانے سے میری صورت ضرور بگڑ گئی تھی، چند دنوں کے لئے۔ مگر اب تو میرے ماہر چشم ساز اور عینک ساز ڈاکٹر سوزانی نے ایسی نقلی آنکھ لگا دی ہے کہ جی چاہتا ہے۔ کہ اپنی اصل آنکھ بھی نکال کر اس کی جگہ دوسری نقلی آنکھ لگوالی جائے۔ غرضیکہ جس منہج سے دیکھیے مجھے ایک آنکھ سے فائدہ ہی نظر آتا ہے۔

پرسوں میرا بڑا چوری ہو گیا۔ تیکے کے نیچے پڑا تھا۔ بڑے میں دس روپے تھے۔ کیونکہ اس سے زیادہ رقم میں بڑے میں نہیں رکھتا ہوں۔ رات کو سیف میں رکھتا ہوں۔ مگر دس روپے ضرور تھے اور دس روپے آخودس روپے ہوتے ہیں!

میں نے اس چوری کا بیوی سے ذکر کیا تو اس نے کانوں پر ہات دھرے۔ جھاڑو بہارو کرنے والی نوکرانی سے پوچھا۔ تو وہ چنچنے چلانے لگی اور اپنی بے گناہی کی قسمیں کھانے لگی۔ بالآخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ نوٹ باورچی کے تیکے کے نیچے سے مل گیا جو چار روز سے بخار میں پڑا تھا۔ میرے ڈرانے دھمکانے پر اس نے اقبال جرم کر لیا کہ دس کا نوٹ اس نے چرایا تھا۔

میں نے اسے زور کے دو دھپ مارے اور کان پکڑ کر اٹھا دیا۔ "ہر انزا دے ہمارا نوکر

ہو کر ہمارے ہی گھر میں چوری کرتا ہے؟"

"جانے دو، جانے دو۔" میری بیوی اس پر ترس کھا کر بولی۔ "دیکھتے نہیں ہو، چار روز سے

بخار میں پڑا ہے۔ انجکشن کے لئے پیسے مانگ رہا تھا میں نے نہیں دیئے۔ میں بھول گئی۔"

"تم بھول گئیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ چوری کرے؟" میں نے بادرچی کے ایک زور

کی ٹھوکر ماری۔ "دھڑام سے فرش پر گرا اور کراہنے لگا۔"

"جانے دو۔ جانے دو۔" میری بیوی بات جوڑ کر بولی۔ "دیکھتے نہیں ہو، بیچارا عزیز

چار روز سے بخار میں جھنک رہا ہے دس روپے تمہارے لے لئے تو تمہارا کون سا ایسا

نقصان ہو گیا۔ تم لاکھوں کماتے ہو؟"

"دس روپے؟" میں نے گرج کر کہا۔ "دس روپے کی تم قدر و قیمت کیا جانو، کتنی بے ایمان

محنت، کیسی غلیظ نمیر فروشی سے میں یہ دس روپے کماتا ہوں۔ تم ان دس روپے کی اہمیت

کیا جانو۔ یہ میں جانتا ہوں؟" اب درگزر کرو؟" نہیں۔ اس نے میرے دس روپے

غائب کئے ہیں۔ میں اس چور کو اس چوری کی قرارداد قلمی سزا دلاؤں گا؟ یہ کہہ کر میں نے

بادرچی کو گردن سے پکڑا اور لے چلا اسے پولیس میں رپورٹ کرنے!...

## جگر گوشے

دس سال سے یعنی جس دن سے میری شادی ہوئی ہے۔ یہی ایک سوال بار بار کسی مذکس صورت میں ہمارے سامنے دہرایا جاتا ہے۔ آپ کے ہاں بچہ کیوں نہیں ہوتا؟ — یہ کوئی نہیں پوچھتا۔ آپ کے ہاں روٹی ہے؟ گھر ہے؟ روزگار ہے؟ خوشی ہے؟ عقل ہے؟ سب یہی پوچھتے ہیں۔ آپ کے ہاں بچہ ہے؟ گویا بچہ ان تمام ضروریات زندگی کا نعم البدل مان لیا گیا ہے۔ ہم دونوں کو اس سوال سے انتہائی کوفت ہوتی ہے۔ مگر کیا کریں سباجی سکون کی خاطر طرح طرح سے اس سوال کو ٹالنا پڑتا ہے۔ میرے ایک دوست ہیں ماشا اللہ سات عدد بچوں کے باپ ہیں۔ اور آٹھویں کی فکر میں ہیں۔ اُن کے بچے اکثر بیمار رہتے ہیں۔ آج ایک کو کالی کھانسی ہے تو دوسرے کو بخار ہے۔ تیسرے کو چیچک نکل آئی ہے تو چوتھے نے سڑک پر گر کر اپنا سر مچھوڑ لیا ہے۔ پانچویں کی آنکھیں دکھتی ہیں تو چھٹا سرن

اس بات پر اُدھار کھائے ہوئے ہے۔ کہ کب کسی مہمان کی گود میں بیٹھے اور پیشاب کرے۔ مگر اس روشن ضمیر اولاد کے والد کو ایک ہی غم کھائے جا رہا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے مجھ سے سوال کرتے رہتے ہیں۔ ”آپ کے ہاں بچہ کیوں نہیں ہوتا۔؟“

میں اس سوال کے جواب میں اکثر اپنی ڈبڑ بائی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر مہابیت مسکین لہجے میں جواب دیتا ہوں ”کیا بتاؤں، نہیں ہوتا۔“ ”گویا اس حادثہ یا عدم حادثہ کی ذمے داری مجھ پر نہیں خدا پر عاید ہوتی ہے۔ مگر میرے دوست کی تسلی اس جواب سے نہیں ہوتی۔ آگے جھک کر بڑے رازدار لہجے میں فرماتے ہیں۔۔

”کسی ڈاکٹر کی مدد لیجئے۔“

میں کہتا ہوں: ”کیسے لے سکتا ہوں۔ جس ڈاکٹر کے ہاں ہم لوگوں کا علاج ہوتا ہے اس کے ہاں خود کوئی بچہ نہیں ہے۔“

وہ فوراً گھبرا کر کہتے ہیں: ”آپ سمجھے نہیں۔ میرا مطلب ہے کسی ڈاکٹر کو دکھائیے۔“

مکن ہے آپ کے اندر کوئی نقص.....“

میں بات کاٹ کر کہتا ہوں: ”دکھایا ہے کوئی نقص نہیں ہے۔“

”اور ہماری بھابھی۔؟“

”بھی ٹھیک ہیں۔“

”وہ بھی ٹھیک ہیں۔ آپ بھی ٹھیک ہیں۔“ میرے دوست حیرت سے کہتے ہیں۔

”پھر بھی بچہ نہیں ہوتا، حیرت ہے صاحب!“

یہ کہہ کر غور سے اور انتہائی شے سے مجھے دیکھنے لگتے ہیں۔ جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔

اور کسی خوفناک بلکہ شرمناک مرض کا شکار ہوں۔ اور ان سے دانستہ چھپا رہا ہوں۔ ان کا بس

نہیں چلتا۔ ورنہ وہ خود کھڑے کھڑے ہم دونوں کا ڈاکٹری معائنہ کر لیں۔

ایک اور دوست ہیں ہمارے! انہیں یہ تو شبہ نہیں ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی میں خدا نخواستہ کوئی نقص ہے۔ مگر وہ یہ مزدور سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ دیدہ و دانستہ بچہ پیدا نہیں کرتے۔ وہ جب بھی ہمارے ہاں آتے ہیں۔ بچوں کے فوائد پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔ البتہ تقریر کرتے وقت اندازِ سیاستدان کا سا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ایسے بردکر کا ہوتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں بچہ ہونے پر فوراً "یکشن" لے گا۔! میں اُن سے بہت اُلجھتا ہوں۔ کیونکہ خواہ مخواہ شبہ ہو جاتا ہے۔ کہ بچہ میں پیدا کر دوں گا۔ لیکن فائدہ ان کو ہو گا۔ جی یہی چاہتا ہے کہ محض ان کو زک دینے کے لئے زندگی بھر کوئی بچہ پیدا نہ کیا جائے۔ اکثر فرماتے رہتے ہیں۔ اگر آپ کے گھر کوئی بچہ ہوتا تو میں ضرور اُس کی شادی اپنی مٹنی سے کرتا۔ اب ان کی مٹنی انتہائی بد صورت بھینگی۔ بد مزاج اور مر گھلتی ہے۔ محلے کے سب بچوں سے لڑتی رہتی ہے۔ اس کے سر پر بال اس قدر کم ہیں کہ بڑی ہونے پر انشاء اللہ واقعی گننی ثابت ہوگی۔ مگر یہ حضرت ہیں کہ میرے گھر میں اسی چاند سی بہو کا اضافہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس مٹنی کو دیکھ کر مجھے نہ صرف اپنے بچے بلکہ ان تمام بچوں کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے۔ جو ابھی پیدا نہیں ہوئے یا جن کے پیدا ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔

ہمارے ایک تایا ہیں۔ پچاسی برس کی عمر ہونے پر بھی اُن کا نام چھٹن لال ہی ہے۔ تایا چھٹن لال بچوں کے بے حد قائل ہیں اور جوں جوں بوڑھے ہوتے جاتے ہیں۔ بچوں کے زیادہ سے زیادہ قائل ہوتے جاتے ہیں۔ گھڑاتے ہی میرے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہیں۔ (مجھ پر کم۔ میری بیوی پر زیادہ) پھر ایک آہ سرد بھر کر کہتے ہیں۔

"انسوس تمہارے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا۔ اُسے گود میں کھلانے کا ارمان دل ہی دل



میں رہ گیا۔“

میں جواب دیتا ہوں۔ ”مجھے ہی گود میں کھلایے۔“

تو اس پر برہم ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

”تو نہیں جانتا۔ تو تو احمق ہے۔ برا پورا احمق! بچے تو گھر کی رونق ہوتے ہیں۔ وہ کبھی

جھگڑتے ہیں۔ کبھی ہنستے ہیں۔ کبھی روتے ہیں۔ کبھی چلاتے ہیں۔ دھول دھپا کرتے ہیں۔ بچوں

کے ہونے سے گھر میں عجیب سی رونق رہتی ہے۔“

میں کہتا ہوں۔ ”اس کام کے لئے ہمسائے کے بچے کیا کافی نہیں ہوتے؟ پھر جہانگ

چینیہ چلانے کا تعلق ہے۔ آدمی بچے کیوں پیدا کرے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کا کوئی ڈرامہ کیوں

دشن لے۔ میں میں چینیہ چلانے کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اس کے لئے ایک بچے کو

نوہینے پیٹ میں رکھنا۔ پھر اسے پالنا پوسنا اور اس پر ہزاروں روپے خرچ کرنا کیا ضروری

ہے۔ جب کہ یہ کام باآسانی ریڈیو کی ایک سٹوڈیو گھمانے سے سرانجام دیا جاسکتا ہے۔“

میری یہ بات سن کر وہ اور برہم ہو جاتے ہیں۔

”تیری تو مت ماری گئی ہے۔ اور تو کو اپنے ساتھ اپنی بیوی کو بھی لے ڈوبے گا۔“ پھر

وہ بڑے پیار سے میری بیوی کی طرف مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ ”کیوں بیٹیا! تجھے تو بچے

پسند ہیں نا۔؟“

اور میری بیوی لجا کر نہایت شرمیلی آواز میں جواب دیتی ہے۔ ”جی ہاں! بشرطیکہ

وہ دوسروں کے ہوں۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہوں۔ اور غسٹانے سے نارغ ہو

چکے ہوں!“

اس پر تمایا جی ہنس پڑتے ہیں۔ اور میری بیوی کے ہاتھ سے دودھ چلبی کھا کر

درخت ہو جاتے ہیں۔ یہ دما دیتے ہوئے ”بھگوان تیری کوکھ ہری کوسے“

اب یہ کون کس کو سمجھائے کہ جوں جوں کوکھ ہری ہوتی جاتی ہے یہ دنیا اُڑتی جاتی ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان کی آبادی دس کروڑ تھی۔ اب چالیس کروڑ ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں آٹا روپے کا ڈیڑھ من تھا۔ اب روپے کا ڈیڑھ سیر بھی شکل سے ملتا ہے۔ سائنسدانوں نے انداز لگایا ہے کہ اگر دنیا کی کوکھ اسی طرح ہری ہوتی رہی تو اگلے تین سو سال کے بعد انسانی آبادی اس قدر بڑھ جائے گی کہ ایک انسان کے ستنے میں صرف ایک مربع گز زمین آئے گی۔ اب اس ایک گز زمین میں آپ چاہے کھڑے ہو لیں چاہے بیٹھ لیں چاہے سولیں یا چہل قدمی کر لیں۔ ایک مربع گز زمین پر آپ اپنا اس پر گھر بنالیجئے۔ اُسی پر اپنی قبر اس سے زیادہ زمین آپ کو تین سو سال کے بعد نہیں ملنے والی ہے۔ اور سائنسدانوں نے یہ بھی اندازہ لگایا ہے کہ جس رفتار سے بچے آج کل پیدا ہو رہے ہیں۔ اس شرح کی مطابق اگلے سات سو سال میں انسانوں کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ ان کا کل وزن مِلّا کے زمین کے وزن سے بڑھ جائے گا۔

لازمًا زمین اتنا بوجھ نہیں سہار سکے گی۔ اور مکڑے مکڑے ہو جائے گی۔ یعنی قیامت آ جائے گی۔ گویا جو بچے پیدا کرنا ہے۔ دھیرے دھیرے قیامت کو قریب لانا ہے۔ مگر ہندوستان میں یہ بات آپ کسی سے نہیں کہہ سکتے۔ کسی کی کوکھ ہری ہو نہ ہو آپ کی چُنڈیا فرید ہری کر دی جائے گی۔

اس لئے بچوں کے سلسلے میں مجھے تو آج تک اپنا ہم خیال نہیں ملا۔ لیکن ایک بار میری بیوی کو ایک ایسی سہیلی مل گئی تھی۔ قعۃ یہ ہوا کہ ایک روز میری بیوی اکیلے سینما دیکھنے چلی گئی۔ کوئی ہندوستانی پچر تھی۔ اُس تصویر میں ٹن ٹن کے بارہ بچے۔ پورے بارہ بچے تلے

اوپر کے دکھائے گئے تھے۔ بارہ بچوں کی لین ڈوری کو دیکھ کر میری بیوی تو ہنسی ہی لیکن ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ایک عورت بھی ہنس پڑی۔ میری بیوی کو دیکھ کر پہلے تو بڑی حیرت ہوئی۔ بعد میں اُس نے اس عورت سے بہنا پا کر لیا۔ بہت بعد میں میری بیوی کو پتہ چلا کہ وہ عورت محض اس لئے ہنسی تھی کہ اُس کے صرف گیارہ بچے تھے! ظاہر ہے گیارہ بچوں والی عورت کو بارہ بچوں والی عورت پر ہنسنے کا پورا پورا حق ہے۔

یہ اکثر کہا گیا ہے کہ بچے قوم کی دولت ہوتے ہیں۔ اگر سچ ہے تو ہندوستان کا شمار دنیا کی امیر ترین قوموں میں کرنا چاہیئے زندگی کے کسی اور شعبے میں ہم دولت پیدا کریں یا نہ کریں۔ بچے پیدا کرنے میں ہمارا کوئی ثمانی نہیں۔ ہمارے محلے میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ نام ان کا دولت رام ہے اور واقعی بچوں کی دولت کے اعتبار سے وہ ہمارے محلے کے رئیس سمجھے جا سکتے ہیں۔ اب تک دس بچے تصنیف فرما چکے ہیں۔ جب ان کے ہاں پہلا بچہ ہوا تو ان کے گھر میں موٹر گاڑی تھی۔ ریفریجیٹر تھا۔ ریڈیو گرام تھا۔ خالیچہ تھا۔ مولہ تھا۔ بجلی کا پنکھا تھا۔ غرضیکہ آرام و آسائش کی ہر چیز مہیا تھی۔ پھر جب دوسرا بچہ پیدا ہوا تو موٹر گئی۔ تیسرے بچے کے تولد ہوتے پر ریڈیو گرام گیا۔ چوتھے پر ریفریجیٹر پانچویں پر خالیچہ۔ چھٹے پر مولہ۔ ساتویں پر پنکھا۔ اب دسویں بچے کی پیدائش پر چند ہفتے ہوئے اُن کے گھر کی بجلی بھی کٹ گئی ہے۔ یعنی جس منزل اور قیام پر کل ہندوستان اور ملکِ زیب کے زمانے سے اب تک ڈیڑھ سو سال میں پہنچا ہے وہ انہوں نے دس سال میں حاصل کر لیا ہے اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں نظر آتے ہیں۔ اکثر ایک بچے کو کندھے پر چڑھاتے۔ دوسرے کو گود میں اٹھاتے تیسرے کو انگلی سے لگاتے میرے پاس آتے ہیں اور چوتھے بچے کو میری گود میں دے کر کہتے ہیں بھال صاحب! اب آپ بھی بال بچوں دلے ہوتے تو اپنے بچے کو گود میں لے کر کیسے خوش

ہوتے؟

اور میں جلدی سے اُن کے بچے کو گود سے اتار کر کہتا ہوں:-

”رہنے دیجئے بھائی صاحب! میں لنڈورا ہی بھلا۔“ اس پر اُن کا بچہ میری گود سے اُترنے سے انکار کر دیتا ہے اور اپنی ناک سے انگلی نکال کر میرے منہ میں ٹھولتے ہوئے کہتا ہے۔

”آہ۔ میرا چاچا لنڈولا۔ میرا چاچا لنڈولا۔۔۔۔۔“

ملاحظہ فرمائیے ان بچوں کے نام کس قدر عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ جوڑ کا ہے۔ گٹو ہے یا بھو ہے۔ یا پکو ہے یا ستو ہے یا بھو ہے۔ وہ را کی ہے۔ کرا کی ہے۔ راتی ہے۔ پاتی ہے۔ چہڑ تقاتی ہے۔ جوڑ کی ہے وہ گیگی ہے۔ گوگی ہے۔ شنی ہے۔ ڈتی ہے۔ پتی ہے۔ پتی ہے۔ الی ہے۔ بلی ہے۔ مرگھتی ہے۔ آج تک آپ نے کسی بچے کا نام قاعدے اور دھنگ کا نہیں سنا ہوگا۔ اس بات سے جہاں والدین کے ذہن کی عزت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہاں اُن بچوں کے مستقبل کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ جو یہ نام لے کر زندگی کے سفر پر نکلتے ہیں۔ اس حساب سے اپنے بچپن میں پنڈت جواہر لال نہرو کا نام ضرور جوڑا ہوگا۔ میک لمن کا بگلی اور کنیڈی اگر ہندوستان میں پیدا ہوتے تو ضرور اُن کا نام کڈا ہوتا! — میرے خیال میں بڑے آدمیوں کی عظمت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بچپن کے مضحکہ خیز ناموں کے باوجود بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔ اور جو عام صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ جیسے کہ اکثر لوگ ہوتے ہیں۔ وہ اسی مضحکہ خیزی کی بدولت ایک مضحکہ انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔

بات اگر ناموں تک ہی محدود ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ اچھے بھلے لوگ۔ ایسے لوگ بھی جن کی انشا پر دازی ادبیت، صفات اور خطابت کی ساری دنیا میں دھوم ہے۔ اپنے بچوں سے اکثر اسی لیے میں مخاطب ہوتے ہیں: ”تو میرا ڈڈو ہے“

پلو ہے۔ چپا گھسٹو ہے۔ میرا ثنا تو اکا با کا ہے۔ کچو پا کا ہے۔ چن ٹا کا ہے۔ اسے تو ہپا کھائے گا؟ تپا کھائے گا؟ دھپا کھائے گا؟ ایں؟ یہ کیا زبان ہے؟ یہ نہ اردو ہے نہ ہندی۔ گجراتی ہے نہ مراٹھی۔ پشتون بلوچی۔ انگریزی ہے نہ لاطینی۔ یہ تو سپر اٹھو تک نہیں۔ خدا جانے کس دیس یا قوم کا فرد اپنے بچے سے اس زبان میں گفتگو کرے گا۔ اور بچے بھی ایسے نامستول ہوتے ہیں۔ کہ غوں غاں کرتے ہوئے بائیں اُچھال کر ٹانگیں اٹھا کر منہ پر جھاگ کے بیلے چھوڑتے ہوئے ہنس ہنس کر سر ہلاتے ہوئے اسی زبان میں جواب تصنیف فرمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالباً دنیا کی یہی ایک واحد زبان ایسی ہے جس کے لئے ڈکٹری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ڈکٹری کیا اس کے لئے کسی کتاب، کسی گرامر، کسی قاعدے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہی زبان سیکھ کر جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور زندگی کے مسائل سے الجھ کر اپنا مافی الضمیر بھی ٹھیک طرح سے بیان نہیں کر سکتے تو اس میں حیرت کی بات کیا ہے؟ یہی بچے جب بڑے ہو کر کتابوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اور بار بار سینا دیکھنے پر اصرار کرتے ہیں تو انہیں قابلِ طاعت کیوں سمجھا جائے۔ سارا تصور اُن کے والدین کا ہے۔ جو اُن کی تربیت ہی اسی انداز سے کرتے ہیں۔

تربیت سے یاد آیا کہ بالعموم بچوں کی تربیت ایک سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ آج کل یہ ایک طرح کا نیشن چل نکلا ہے کہ بچوں کو روکو نہ روکو۔ جو اُن کا جی چاہے وہی کرنے دو۔ سنا ہے اس سے بچوں کی بہت سی نفسیاتی الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ یعنی وہ الجھنیں جو بڑے ہونے پر اُن کو لاحق ہو سکتی تھیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ایسی نفسیاتی ایجاد کا سہرا فرائیڈ کے سر ہے۔ جس سے بڑا الجھنوں کا بانی اور گورکھ دہندے باز اس دنیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ میرے عزیز دوست دولت رام فرائیڈ کے اس مقولے پر بڑی پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ بلکہ بچوں کو بے راہروی پر اُکساتے ہیں۔ یعنی فرائیڈ سے بھی دو ہاتھ آگے جاتے ہیں۔



ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ یہ حضرت مع اپنی بیوی کے اور چھ بچوں کے ہمراہ گھر میں اس دقت وارد ہوئے جب ہم میاں بیوی نہادھو کر اُبلے کپڑے پہن کر سینا جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمارے ہندوستانی سماج کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ آپ کتنے ہی ضروری کام یا ضروری تفریح کے لئے جا رہے ہوں گھر میں اگر مہمان آجائے تو آپ کہیں نہیں جاسکتے۔ مہمان سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ کو لامحالہ رُکنا پڑے گا۔ رُک کر گھنٹوں بات کرنا پڑے گی اور باتوں کے دوران میں بات بے بات بلاوجہ یوں ہنسنا پڑے گا۔ الغرض یوں ظاہر کرنا پڑے گا کہ آپ اپنے ہمسائے کی آمد سے بے حد خوش ہوئے ہیں۔ حالانکہ اندر ہی اندر آپ کا دل انہیں قتل کرنے کو چاہتا ہو گا۔ مگر تہذیب مانع ہے۔ آپ مُسکرا کر اور خون کا گھونٹ پی کر دہسائے کا نہیں اپنا غیر مقدم کرنے پر مجبور ہیں۔

مگر ہمسائے کے لئے تو کسی غیر مقدم کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کو ہو تو ہو۔ ہمسائے کو نہیں ہوتی۔ چنانچہ دولت رام نے آتے ہی میری پیٹھ پر ایک زور کا دھپ دیا۔ اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بڑی بے تکلفی سے میری ہڈی پسلی ایک کرتے ہوئے مجھ سے پیٹ گئے مسز دولت رام نے میری بیوی سے باتیں شروع کر دیں اور بچوں نے غالیجے پر کھڑے ہو کر چاروں طرف کمرے کے سامان کایوں جائزہ لینا شروع کر دیا۔ جیسے وہ کسی کمرے میں نہیں کسی جنگل میں اُنکے ہوں۔ اُس کے بعد دو بچوں نے مارزن کی طرح ایک خوفناک چیخ اپنے حلق سے نکالی اور ریڈیو گرام کی طرف لپکے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مگر بچوں کو کسی کے دل کے دورے سے کیا غرض۔ چنانچہ ایک بچے نے بڑھکے ریکارڈ بجانے شروع کر دیئے۔ دوسرے نے ریڈیو کی سوئی گھمائی شروع کر دی۔ تیسرا بچہ بگ شیلیف پر چڑھ گیا۔ اور کتابیں نکال کر باہر پھینکنے لگا۔ چوتھا بچہ ادنیٰ کے کارنر پیس پر پڑے ہوئے گلہ ان کے پھولوں

کو لاپٹی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر ایک سٹول اٹھا کر کار فرمیں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

”کیا حال ہے؟“ دولت رام نے ایک تہقہہ لگاتے ہوئے میری پیٹھ پر دوسرا دھتپ مارا۔  
”اچھا ہوں!“ میں نے کانپ کر مری ہوئی آواز میں کہا۔

اتنے میں ایک زور کا تڑاخہ ہوا۔ میں نے گہرا کر دیکھا۔ چوتھے بچے نے گلدان سے پھول گھیننے کی کوشش میں پھولدان ہی کو گھسیٹ لیا تھا اور اب پھولدان فرش پر گر کر ایک سو ایک ٹکڑوں میں بکھرا پڑا تھا۔

”یہی وہ گلدان ہے نا۔ جو آپ خورجے سے لائے تھے؟“ مسٹر دولت رام نے بڑے اطمینان سے مجھ سے پوچھا۔

”نہیں وہ تو پچھلے ہفتے ہی ٹوٹ چکا تھا۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”جب آپ اپنے سب سے چھوٹے بچے کی سالگرہ کی دعوت کے سلسلے میں تشریف لائے تھے؟“

”ارے وہ تو دوسرا گلدان تھا۔“ مسٹر دولت رام نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

”جیسے ہمارے پٹونے توڑا تھا۔“ پھر وہ میری بیوی کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔ ”یہ (اپنے شوہر کی طرف اشارہ کر کے) بڑے ٹھکڑے ہیں۔ انہیں کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ کون گلدان کب ٹوٹا تھا۔ کون کب؟“

میری بیوی جواب میں کچھ خوفزدہ سی ہو کر غمنماں۔ اتنے میں ریڈیو گرام سے ایک بیانیہ سی چیخ بلند ہوئی۔ اور میں نے دیکھا کہ دونوں لڑکے آپس میں لڑ رہے ہیں اور ریڈیو کے دونوں بٹن ریڈیو گرام سے نکل کر ان کے ہاتھوں میں آچکے ہیں۔ بڑے لڑکے نے چھوٹے لڑکے کے گھونٹہ مارا۔

”شاباش! دولت رام خوشی سے چلایا۔

مگر گھونسلے لٹکے پر پڑنے کے بجائے ریڈیو گرام کے کاپنج پر پڑا۔ اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور لٹکا سہم کر ریڈیو گرام سے الگ کھڑا ہو کر بسورنے لگا۔

”وڑ گیا میرا لال! مسز دولت رام جلدی سے اپنے بچے کو اپنے گھٹنوں اتنے میں میں نے کیا دیکھا کہ تین بچے کتابوں پر جھکے ہوئے ہیں اور تصویریں پھاڑ پھاڑ کر الگ کر رہے ہیں۔ بچوں کو مطالعے کا کس قدر شوق ہوتا ہی سمجھ میں آئی۔ اتنے میں دیوان غالب کے مصوٰر ایڈیشن پر دو بچوں کا جھگڑا بچے اُس کتاب کو اپنی اپنی طرف کھینچنے لگے۔ کھینچنے میں آدھی کتاب ایک بچے گئی آدھی دوسرے بچے کے ہاتھ میں رہ گئی۔ اور غالب زبان حال سے کہتا ہوا باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تمارا پانچواں اور چھٹا بچہ دونوں بڑے ہوشیار تھے۔ انہوں نے ڈرائنگ اور درزاتے ہوئے کھانے کے کمرے میں گھس گئے تھے۔ اور وہاں سے سنگترہ تر بوز کی تاشیں اٹھالائے تھے۔ کچھ کھا رہے تھے۔ کچھ مار رہے تھے۔ ایک بچے سے جا لگا۔ اور وہاں سے اُچھل کر دیوار سے لگنے والا تھا کہ دولت رام نے میں کیچ کر لیا۔ اور میری طرف فاتحانہ انداز سے دیکھ کر بولے۔

”اب تو عادت چھوٹ گئی۔ لیکن بچپن میں کرکٹ کا بہت عمدہ کھلاڑی۔“

اس پر میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے اپنی بیوی کا رنگ متغیر ہوتے دیکھا اور پھر دیکھا کہ چھٹے بچے کی نگاہیں میری بیوی کی نئی شان کی جڑ گیا ساڑھی پر ہیں۔ بالکل نئی اور خوبصورت ساڑھی تھی۔ جو جگہ جگہ زرد دوزی کے کام سے جھلجھل کر رہی تھی۔ غریب بچے کا دل اُس

